سلسلۂ مطبوعات ادارۂ دار الاسلام نمبر (۱)

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصہ اول

اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت اور مستقبل کے امکانات پر ایک تبصرہ

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

مکتبہ جماعت اسلامی۔ دار الاسلام پٹھان کوٹ

قیمت ۸ (پنجاب) غیر مجلد

فہرست مضامین

بار ششم ... ۲۰۰۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

آنکھیں بند کر کے چلنا ایک شخص کے لئے جتنا مہلک ہو سکتا ہے، اس سے بہت زیادہ مہلک ایک قوم کے لئے ہوتا ہے۔ آپ کھلے میدان میں بھی بند آنکھوں کے ساتھ چل کر ٹھوکر سے محفوظ نہیں رہ سکتے لیکن سڑک پر جہاں آمد و رفت کا ہجوم ہو، اور دو نو ں دوں کے درمیان کشمکش ہو رہی ہو، اگر آپ آنکھیں بند کر کے چلیں گے، تو یقیناً آپ کو کسی مہلک حادثہ سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ایسی ہی حالت ایک قوم کی بھی سمجھئے۔ معمولی حالات میں جبکہ فضا میں کوئی غیر معمولی ہنگامہ نہ ہو، اس کے لئے آنکھیں ——— جسمانی نہیں عقل و بصیرت کی آنکھیں ——— بند کر کے چلنا محض نقصان اور مضرت کا موجب ہوتا ہے، مگر جب کوئی انقلاب درپیش ہو، جب قسمتوں کا فیصلہ ہو رہا ہو، جب زندگی و موت کا مسئلہ سامنے ہو، ایسے وقت میں اگر وہ آنکھیں بند کر کے چلے گی تو اسے تباہی اور ہلاکت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

یہی خیالات تھے جن کے تحت میں نے محرم ۱۳۵۶ھ سے "ترجمان القرآن" میں ان مضامین کا سلسلہ شروع کیا، جن کا صرف ایک حصہ اس مجموعہ کی شکل میں شائع ہو رہا ہے۔ تحریکِ خلافت کی ناکامی کے بعد سے کامل پندرہ برس تک مسلمان جس انتشارِ فکر و عمل میں مبتلا رہے، اس کو دیکھ کر دل خون ہوا جاتا تھا، مگر ہمیشہ یہی خیال لب کشائی سے روکتا رہا، کہ میدان میں مجھ سے زیادہ علم اور تجربہ اور قوت و اثر رکھنے والے موجود ہیں، وہ کبھی نہ کبھی حالات کی اصل خرابی کو محسوس کریں گے، اور اس کو رفع کرنے کے لئے متحد ہو کر وہ تدبیریں اختیار کریں گے، جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کو اختیار کرنی چاہئیں۔ لیکن دن پر

دن گذرتے چلے گئے اور یہ امید بر نہ آئی، یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جو ہندوستانی مسلمان کے لئے قسمت کے فیصلے کا آخری وقت ہے۔ دل کی آنکھوں نے صاف دیکھ لیا کہ اب اگر اس قوم نے کوئی غلط قدم اٹھایا تو سیدھی ہلاکت کے گڑھے کی طرف جائیگی، اور اس کے ساتھ چشم دل ہی نے نہیں چشم سر نے بھی یہ دیکھا کہ جن کی تدبیروں اور تدبیر پر اس قوم کے مستقبل کا انحصار ہے وہ اب بھی حالات کو اس فراست کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں، جسے "فراستِ مومن" کہا گیا ہے، اور اسی کوتاہی کی بنا پر ایسے نازک وقت میں مسلمانوں کو ان مختلف راستوں کی طرف چلا رہے ہیں، جن میں سے کوئی بھی منزل نجات کی طرف نہیں جاتا۔ اس مرحلے پر پہنچ کر ضمیر نے آواز دی کہ یہ وقت خاموش بیٹھنے کا نہیں ہے۔ اب دین و ملت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ مسلمانوں کو ان کے عوام اور خواص، علماء اور زعماء، سب کو ان حقیقی خطرات کی طرف توجہ دلائی جائے، جو "مسلم قوم" ہونے کی حیثیت سے ہمیں در پیش ہیں، اور اس کے ساتھ انھیں یہ بھی یاد دلایا جائے، کہ تمھارے لئے ہدایت کا اصلی سرچشمہ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سیرتِ پاک میں ہے جسے چھوڑ کر محض اپنی فکر و تدبیر پر اعتماد کر لینا ہلاکت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا

اس مجموعہ میں صرف وہ مضامین درج کئے جا رہے ہیں، جو ترجمان القرآن میں محرم ۵۶ھ سے رجب ۵۷ھ تک شائع ہوئے ہیں۔ میں نے ان میں اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ اور موجودہ حالت پر محض ایک مورخ یا ایک سیاسی آدمی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے نظر ڈالی ہے۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ ایک خالص تاریخی، یا سیاسی، یا معاشی نظر رکھنے والے آدمی کو میرے بیان سے اختلاف ہو، لیکن میں یہ گمان نہیں کرتا کہ جو شخص میری طرح ایک مسلمان کی نظر سے حالات کو دیکھے گا، اسے میرے بیان سے اختلاف ہوگا۔ اسی طرح میں نے ہندوستان کے موجودہ حالات اور ان کی کارفرما قوتوں کا جو تجزیہ کیا ہے، اس میں بھی میرے پیش نظر اسلامی معیار تحقیق ہے، اور ان حالات میں مسلمانوں کے اصل قومی مسائل کو سمجھنے اور ان کا حل تلاش کرنے کی جو کوشش میں نے کی ہے وہ بھی ایک مسلمان کی حیثیت سے کی ہے۔ درحقیقت اس تمام بحث میں میرے مخاطب صرف وہی لوگ ہیں، جو اول بھی مسلمان ہیں اور آخر بھی مسلمان ہیں اور مسلمان کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو صرف ہندوستانی ہیں،

یا پہلے ہندوستانی اور پھر سب کچھ ہیں، تو ان سے مجھے سروکار ہی نہیں۔ وہ ایک جہاز کے مسافر ہیں، اور میں دوسرے جہاز کا مسافر ہوں، ان کی منزل مقصود دوسری ہے اور میری منزل مقصود دوسری۔ ان کو صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے سیاسی آزادی اور معاشی استقلال درکار ہے، عام اس سے کہ مسلمان رہیں یا نہ رہیں۔ اور مجھے وہ آزادی درکار ہے جس کے ذریعہ سے میں اپنی زوال پذیر اسلامی طاقت کو سنبھال لوں، اپنی زندگی کے مسائل کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے حل کروں، اور ہندوستان میں مسلم قوم کو پھر سے ایک خود مختار قوم دیکھوں۔ ان کے لئے ہندوستان کا سیاسی و معاشی استقلال بجائے خود ایک مقصد ہے، اور میرے لئے وہ حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے، جو اگر حصول مقصد میں مددگار نہ ہو تو مجھے بجائے خود اس ذریعہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ پس میرے اور ان کے درمیان مقصدی اختلاف ہے، اس لئے ان سے بحث کرنا تو میرے نزدیک محض تضییع وقت ہے۔ البتہ جو لوگ اس مقصد میں مجھ سے متفق ہیں ان کو میں دعوت دیتا ہوں کہ وہ ان مضامین کو غور سے ملاحظہ فرمائیں، جو کچھ حق پائیں اسے قبول کریں، اور جس چیز میں غلطی پائیں اس کا غلط ہونا دلیل و حجت سے ثابت کر دیں، تاکہ میں بھی اپنے خیالات کی اصلاح کر سکوں۔

میں جانتا ہوں کہ جو لوگ مقصد میں مجھ سے اتفاق رکھتے ہیں، ان میں سے بھی بہت سے حضرات میرے ان خیالات سے متفق نہیں ہیں، جن کا اظہار میں نے اپنے مضامین میں کیا ہے۔ مگر اس قسم کے جن حضرات نے اخبارات میں اور پرائیوٹ خطوط میں میرے مضامین پر تنقیدیں کی ہیں، ان کی تنقیدوں کو دیکھ کر میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا، آخر انھیں اختلاف کس چیز سے ہے؟ عموماً ان کی تحریروں کو دیکھ کر تو میں نے یہ اندازہ کیا ہے کہ وہ محض سرسری نظر میں یہ دیکھ کر کہ ایک شخص ان کے طریق کار سے اختلاف کر رہا ہے، پوری طرح اس کے خیالات کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے، اور تنقید لکھنی شروع کر دیتے ہیں۔ اکثر حضرات نے میرے اوپر وہ اعتراضات کئے ہیں جن کا جواب میں خود ہی اپنے مضامین میں دے چکا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر انھوں نے ان مضامین کو پڑھا بھی ہے تو دل کے دروازوں کو بند کر کے پڑھا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ یہ طریقہ اہل حق کے لئے مناسب نہیں ہے۔ ہم

کوئی مجلس مناظرہ تو قائم نہیں کر رہے ہیں جس کا مقصد محض دماغی زور آزمائی ہوتا ہے، اور جس میں ہر فریق پہلے ہی سے یہ فیصلہ کرکے شریک ہوتا ہے کہ دوسرے کی بات نہ مانے گا۔ اور اپنی بات پر اڑا رہے گا۔ ہمارا مقصد تو اس ملت کی حفاظت اور سربلندی ہے جو ہم میں سے ہر ایک کو یکساں عزیز ہے۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر جو شخص کچھ کہہ رہا ہے، اس کی بات کو کھلے دل کے ساتھ سنیے، پوری طرح سنیے، ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیجئے، اور یہ فرض نہ کر لیجئے کہ جو طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے، وہ وحی کے ذریعہ سے نازل ہوا ہے، اس لئے اس کے خلاف جو کچھ بھی کہا جائے۔ وہ بہرحال باطل ہی ہونا چاہئے۔ وہ غریب آپ سے لڑنے کے لئے نہیں اٹھا ہے بلکہ غور و فکر کی دعوت دینے کے لئے اٹھا ہے، وہ چاہتا ہے کہ آپ قدم اٹھانے سے پہلے اپنی منزل مقصود معین کرلیں اور اس منزل کی طرف جانے کے لئے وہ راستہ معلوم کریں جو یقیناً صحیح ہو، جس کی صحت اتنی ہی یقینی ہو جتنی ہدایت ربانی کی صحت یقینی ہے۔ بس آپ جویائے حق بن کر اس کے معروضات کا مطالعہ کریں اور دوران مطالعہ میں صواب کو خطا سے میز کرتے چلے جائیں۔ جو کچھ صواب نظر آئے اسے قبول کرلیں اور جس چیز میں خطا پائیں اس کے متعلق واضح طور پر بتا دیں کہ اسے کس بنا پر آپ خطا سمجھتے ہیں۔ آیا وہ کتاب اللہ کے خلاف ہے؟ سنت رسول اللہ کے خلاف ہے؟ عقل کے خلاف ہے؟ یا کسی اور ایسی چیز کے خلاف ہے جو تمیز حق و باطل کی معیار ہو؟ اس توضیح سے راقم کو بھی اپنے خیالات پر نظرثانی کرنے کا موقع ملے گا اور نیک نیتی کے ساتھ مباحثہ کرکے ہم سب ایک صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں گے۔ یا اگر اختلاف باقی بھی رہا تو کم از کم غلط فہمیاں باقی نہ رہیں گی۔

اس مقدمہ کو ختم کرنے سے پہلے ایک بات اور عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ ترجمان القرآن میں اب تک میں نے جو کچھ لکھا ہے اور آیندہ جو کچھ لکھوں گا اس میں میرا مقصد مسلمانوں کے کسی گروہ کی حمایت کرنا اور کسی دوسرے گروہ کو جمہور مسلمین کے سامنے خطاکار ٹھہرانا نہیں ہے، اس لئے تمام ناظرین سے میری استدعا ہے کہ وہ ان مضامین کو پڑھتے وقت اپنے ذہن کو پارٹی فیلنگ اور بدگمانی سے محفوظ رکھیں میں گروہ بندی سے ہمیشہ دامن کش رہا ہوں، اور مجھے فطرتاً اس چیز سے نفرت ہے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام گروہ اپنے احزابی تعصبات سے دل کو پاک کرکے خالص اسلامی نقطۂ نظر سے اپنی

قوم کو اور ہندوستان کے موجودہ حالات کو دیکھیں اور اسلامی ذہنیت کے ساتھ اپنے لئے راہِ نجات تلاش کریں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ جب ایک نظر اور ایک ہی ذہنیت کے ساتھ مشاہدہ اور تفکر کیا جائے گا اور نفسانیت کا شیطانی عنصر بیچ میں نہ رہے گا، تو یہ نزاعات جو مین خانہ بربادی کے موقع پر گھر والوں کے درمیان برپا ہیں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔

جو حضرات ترجمان القرآن میں ان مضامین کا مطالعہ فرما چکے ہیں، ان سے عرض کروں گا کہ اس مجموعہ کو پھر ایک مرتبہ اول سے آخر تک ملاحظہ فرمائیں، اس لئے کہ نظرِ ثانی کے بعد اب اس میں بہت سے مباحث کا اضافہ کر دیا گیا ہے، جن کی طرف تسوید اول کے موقع پر ذہن منتقل نہ ہوا تھا، نیز قریب قریب ان تمام اعتراضات کو رفع کیا گیا ہے جو ان مضامین کو دیکھ کر مختلف اصحاب نے اخبارات میں اور نجی خطوط میں کئے ہیں۔

ابوالاعلیٰ

۲۹ رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ

آنے والا انقلاب اور مسلمان

ہندوستان میں تیزی کے ساتھ ایک نیا انقلاب آرہا ہے۔ جو بلحاظ اپنے اثرات اور اپنے نتائج کے ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے بھی زیادہ شدید ہوگا۔ پھر اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانہ پر ایک دوسرے انقلاب کا سامان تمام دنیا میں ہو رہا ہے، اور بہت ممکن ہے کہ یہ وسیع تر انقلاب ہندوستان پر اثر انداز ہو کر یہاں کے متوقع انقلاب کا رُخ ایک ایک پھیر دے اور اس کو ہماری توقعات سے بہت زیادہ پُر خطر بنا کر رہے۔

جو لوگ خس و خاشاک کی طرح ہر رَو میں بہنے کے لئے تیار رہیں، اور جن کو خدا نے اتنی سمجھ بوجھ ہی نہیں دی ہے کہ اپنے لئے زندگی کا کوئی راستہ متعین کر سکیں، ان کا ذکر تو قطعاً فضول ہے۔ انھیں غفلت میں پڑا رہنے دیجئے، زمانہ کا سیلاب جس رُخ پر بہے گا وہ آپ سے آپ اُسی رخ پر بہہ جائیں گے۔ اسی طرح ان لوگوں سے بھی قطع نظر کیجئے جو آنے والی انقلابی قوتوں پر سمجھ بوجھ کر ایمان لائے ہیں، اور بالارادہ اسی رُخ پر جانا چاہتے ہیں جس پر زمانہ کا طوفانی دریا جارہا ہے۔ اب صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں، جو مسلمان ہیں، مسلمان رہنا چاہتے ہیں مسلمان مرنا چاہتے ہیں، اور یہ تمنا رکھتے ہیں، کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب زندہ رہے اور ہماری آیندہ نسلیں محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی راہ راست پر قائم رہیں۔ ان لوگوں کے لئے یہ وقت رواروی سے گذار دینے کا نہیں بلکہ گہری سوچ اور غایت درجہ کے غور و فکر کا ہے۔ وہ اگر اس نازک وقت میں غفلت اور بے پروائی سے کام لیں گے، تو ایک جرم عظیم کا ارتکاب کریں گے اور اس جرم کی سزا صرف آخرت ہی میں نہ ملے گی بلکہ اسی دنیا کی زندگی میں ان پر چھا جائے گی۔ زمانہ کا بے درد ہاتھ ان کی آنکھوں کے سامنے تہذیب اسلامی کے ایک ایک نشان کو مٹائے گا، اور وہ بے بسی کے ساتھ اس کو دیکھا کریں گے۔ زمانہ ان کے قومی وجود کو ملیا میٹ کرے گا، ایک ایک کر کے ان امتیازی حدود کو

ڈھائے گا، جن سے اسلام غیر اسلام سے ممیز ہوتا ہے اور اس خصوصیت کو فنا کر دے گا جس پر مسلمان دنیا میں فخر کرتا رہا ہے، وہ یہ سب کچھ دیکھیں گے اور کچھ نہ کر سکیں گے۔ ان کی آنکھیں خود اپنے گھروں میں اپنی نوخیز نسلوں کو خدا پرستی سے دور، اسلامی تہذیب سے بیگانہ اور اسلامی اخلاق سے عاری دیکھیں گی، اور آنسو تک نہ بہا سکیں گی۔ ان کی اپنی اولاد اس فوج کی سپاہی بن کر اٹھے گی جسے اسلام اور اس کی تہذیب کے خلاف صف آرا کیا جائے گا۔ اور اپنے ان جگر گوشوں کے ہاتھ سے تیر کھائیں گے، اور جواب میں کوئی تیر نہ چلا سکیں گے۔

یہ انجام یقینی ہے، اگر کام کے وقت کو غفلت میں کھو دیا گیا۔ انقلاب کا عمل شروع ہو چکا ہے، اس کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں، اور اب فکر و عمل کے لئے بہت ہی تھوڑا وقت باقی ہے۔

اسلامی ہند کی گزشتہ تاریخ پر ایک نظر ہندوستان میں اسلام کی گزشتہ تاریخ پر جو لوگ نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس ملک میں اسلامی تہذیب کی بنیاد ابتدا ہی سے کمزور ہے۔ صدر اول میں اور اس سے متصل بعد کی قرنوں میں اسلامی سیلاب کی جو لہریں ہندوستان تک پہنچیں وہ زیادہ تر خس و خاشاک اور کثافتیں لے کر آئیں، اس لئے کہ اس زمانہ میں ہندوستان دارالاسلام کی آخری سرحدوں پر تھا اور وہ سب لوگ جو اسلام کے مرکزی اقتدار یا اصولی عقیدہ و مسلک کے خلاف بغاوت کرتے تھے، عموماً بھاگ بھاگ کر اسی طرف آجاتے تھے، چنانچہ سندھ اور کاٹھیاواڑ اور گجرات وغیرہ ساحلی علاقوں میں جو گمراہیاں آج تک پائی جاتی ہیں وہ اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ اس کے بعد چھٹی صدی ہجری میں جب اصل دھارے نے ہندوستان کی طرف رخ کیا تو وہ خود عجمی کثافتوں سے بہت کچھ آلودہ ہو چکا تھا۔ امراء میں روح جہاد اور علماء میں روح اجتہاد سرد ہو چکی تھی۔ ہمارے حکمران زیادہ تر وہ لوگ تھے، جن کو خراج اور توسیع مملکت کی فکر تھی۔ اور ہمارے مذہبی پیشواؤں میں اکثریت ان حضرات کی تھی جن کی زندگی کا مقصد حکومت کے مناصب حاصل کرنا اور ہر قیمت پر اپنے مذہبی اقتدار کی حفاظت کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ یہاں صحیح معنوں میں کبھی اسلامی حکومت قائم ہوئی، نہ حکومت نے پوری طرح وہ فرائض انجام دیے، جو شرعاً اس پر عائد ہوتے تھے، نہ اسلامی علوم کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قائم ہوا، نہ اشاعت اسلام کی کوئی خاص کوشش کی گئی، نہ اسلامی تہذیب کی ترویج

اور اس کے حدود کی نگہداشت جیسی ہونی چاہئے ویسی ہو سکی۔ علماء اور صوفیہ کے ایک مختصر گروہ نے بلا شبہ نہایت بیش بہا خدمات انجام دیں اور انہی کی برکت ہے کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں کچھ علمِ دین، اور کچھ اتباعِ شریعت پایا جاتا ہے۔ لیکن ایک قلیل گروہ ایسی حالت میں کیا کر سکتا تھا، جبکہ قوم کے عوام جاہل اور ان کے سردار اپنے فرائض سے غافل ہوں۔

اسلام کی عام کشش سے متاثر ہو کر ہندوستان کے کروڑوں آدمی مسلمان ہوئے، مگر اسلامی اصول پر ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک کی اسلامی آبادی کا سوادِ اعظم ان تمام مشرکانہ اور جاہلانہ رسوم و عقائد میں گرفتار رہا، جو اسلام قبول کرنے سے پہلے ان میں رائج تھے۔

جو مسلمان باہر سے آئے تھے ان کی حالت بھی ہندوستانی نومسلموں سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھی۔ ان پر عجمیت پہلے ہی غالب ہو چکی تھی۔ نفس پرستی اور عیش پسندی کا گہرا رنگ ان پر چڑھ چکا تھا۔ اسلامی تعلیم و تربیت سے وہ خود پوری طرح بہرہ ور نہ تھے۔ زیادہ تر دنیا ان کو مطلوب تھی۔ خالص دینی جذبہ ان میں سے بہت کم، بہت ہی کم لوگوں میں تھا۔ وہ یہاں آکر بہت جلدی عام باشندوں میں گھل مل گئے، کچھ ان کو متاثر کیا، اور کچھ خود ان سے متاثر ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں مسلمانوں کا تمدن، اسلامیت، عجمیت اور ہندیت کی ایک معجونِ مرکب بن کر رہ گیا۔

عام طور پر جو طرزِ تعلیم یہاں رائج ہوا وہ اسی ڈھنگ کا تھا جسے انگریزوں نے بعد میں اختیار کیا۔ اس کا بنیادی مقصد حکومت کی خدمات کے لئے لوگوں کو تیار کرنا تھا۔ قرآن اور حدیث کے علوم جن پر اسلامی تہذیب کی بنیاد قائم ہے، یہاں کے نظامِ تعلیمی میں بہت ہی کم بار پا سکے۔

طرزِ حکومت بھی قریب قریب اسی ڈھنگ کا رہا جس کی تقلید بعد میں انگریزوں نے کی۔ بلکہ اپنی قومی تہذیب کی حفاظت اور ترویج اور اس کے حدود کی نگہداشت کا جتنا خیال انگریزوں نے رکھا ہے، اتنا بھی مسلمان حکمرانوں نے نہ رکھا۔ خصوصیت کے ساتھ مغل فرماں رواؤں نے اس باب میں جس سہل انگاری سے کام لیا ہے اس کی مثال تو شاید کسی حکمران قوم میں نہ مل سکے گی۔

ظاہر ہے کہ جس قوم کی تعلیم اور سیاست دونوں اپنی قومی تہذیب کی حفاظت سے دست کش

ہو جائیں اس کو زوال سے کوئی قوت نہیں بچا سکتی۔

انحطاط کا آغاز اور اس کے ابتدائی آثار گیارہویں صدی ہجری میں انحطاط اپنی آخری حدوں پر پہنچ چکا تھا مگر عالمگیر کی طاقتور شخصیت اس کو روکے ہوئے تھی۔ بارہویں صدی کی ابتدا میں جب قصر اسلامی کا یہ آخری محافظ دنیا سے رخصت ہوا تو وہ تمام کمزوریاں یکایک نمودار ہو گئیں جو اندر ہی اندر صدیوں سے پرورش پا رہی تھیں۔ تعلیم و تربیت کی خرابی اور قومی اخلاق کے اضمحلال اور نظام اجتماعی کے اختلال کا پہلا نتیجہ سیاسی زوال کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مسلمانوں کی سیاسی جمعیت کا شیرازہ دفعۃً درہم برہم ہو گیا۔ قومی اور اجتماعی مفاد کا تصور ان کے دماغوں سے نکل گیا۔ انفرادیت اور خود غرضی پوری طرح ان پر مسلط ہو گئی۔ ان میں ہزاروں ہزار خائن اور غدار پیدا ہوئے جن کا ایمان کسی نہ کسی قیمت پر خریدا جا سکتا تھا۔ اور جو اپنے ذاتی فائدے کے لئے بڑے سے بڑے قومی مفاد کو بے تکلف بیچ سکتے تھے۔ ان میں لاکھوں بندگان شکم پیدا ہوئے جن سے ہر دشمن اسلام تھوڑی سی رشوت یا حقیر سی تنخواہ دے کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بدتر سے بدتر خدمت لے سکتا تھا۔ ان کے سواد اعظم سے قومی غیرت اور خودداری اس طرح مٹ گئی کہ دلوں میں اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ وہ دشمنوں کی غلامی پر فخر کرنے لگے غیروں کے بخشے ہوئے خطابات اور مناصب میں ان کو عزت محسوس ہونے لگی۔ دین اور ملت کے نام پر جب کبھی ان سے اپیل کی گئی وہ پتھروں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔ اور جب کبھی کوئی غیرت مند شخص اقتدار قومی کے گرتے ہوئے قصر کو سنبھالنے کے لئے اٹھا، اس کا سر خود اس کی اپنی قوم کے بہادروں نے کاٹ کر دشمنوں کے سامنے پیش کر دیا۔

اس طرح ڈیڑھ صدی کے اندر اسلام کا اقتدار ہندوستان کی سرزمین میں بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا، اور سیاسی اقتدار کے مٹتے ہی یہ قوم افلاس، غلامی، جہالت اور بد اخلاقی میں مبتلا ہو گئی۔

انگریزی حکومت کے دور میں مسلمانان ہند کی حالت ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ دراصل ایک سیاسی انقلاب کی تکمیل اور ایک دوسرے انقلاب کی تمہید تھا۔ جن کمزوریوں نے مسلمانوں سے سیاسی اقتدار چھینا تھا، وہ حسب سابق حالہ قائم تھیں، اور ان پر مزید کمزوریوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کے اندر اسلامی تہذیب کی بنیاد پہلے سے کمزور تھی۔ اس کمزوری نے جب حکومت کے منصب سے ان کو ہٹا دیا۔ اور افلاس و غلامی کی دہری مصیبت میں

وہ گرفتار ہوئے، تو دوسری اور کمزوریاں رد بلاد آگئیں۔

دین اور اخلاق اور تہذیب اور تمدن یہ سب چیزیں بلند تر انسانیت سے تعلق رکھتی ہیں، اور ان کی قدر و عزت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو حیوانیت سے بالاتر ہوں۔ پیٹ اور روٹی اور کپڑا اور آسائش بدن اور لذاتِ نفس وہ چیزیں ہیں جو انسان کی حیوانی ضروریات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور جب انسان مقام حیوانی سے قریب تر ہوتا ہے، تو اس کی نگاہ میں یہی چیزیں زیادہ اہم ہوتی ہیں حتیٰ کہ وہ ان کی خاطر بلند تر انسانیت کی ہر متاعِ گراں مایہ کو نہ صرف قربان کر دیتا ہے، بلکہ حیوانی زندگی کی آخری حدوں پر پہنچ کر اس میں یہ احساس بھی باقی نہیں رہتا کہ میرے لئے کوئی چیز ان چیزوں سے اعلیٰ اور ارفع بھی ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کا مسلمان جب اپنا سیاسی اقتدار کھو رہا تھا، اس زمانہ میں اس کی انسانیت بالکل فنا نہیں ہوئی تھی؛ اس لئے وہ پیٹ اور بدن پر انسانیت کی گراں قدر متاعوں کو قربان تو کر رہا تھا، مگر اس کو یہ احساس ضرور تھا کہ یہ متاعیں گراں قدر ہیں، اور کسی نہ کسی طرح ان کی بھی حفاظت کرنی چاہئے۔ لیکن جب وہ سیاسی اقتدار کھو چکا تو افلاس نے پیٹ اور بدن کے سوال کو ہزار گنا زیادہ اہم بنا دیا، اور غلامی نے غیرت اور خودداری کے تمام احساسات کو مٹانا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی انسانیت روز بروز پست ہوتی چلی گئی، اور حیوانیت کا اثر بڑھتا اور چڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ابھی ایک صدی بھی پوری نہیں گذری ہے اور حال یہ ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل پہلی نسل سے زیادہ نفس پرست، بندۂ شکم اور آسائشِ بدن کی غلام بن کر اٹھ رہی ہے۔ ستر برس پہلے وہ مغربی تعلیم کی طرف یہ کہہ کر گئے تھے، کہ ہم صرف اپنی حیوانی ضروریات پوری کرنے کے لئے ادھر جا رہے ہیں، اپنے دین و اخلاق اور اپنی قومی تہذیب و تمدن کو ہم کھونا نہیں چاہتے۔ اور واقعہ بھی یہ تھا کہ اس وقت تک یہ چیزیں ان کی نگاہ میں کافی اہمیت رکھتی تھیں لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، وہ بنیادی کمزوریاں جنھوں نے ان کو حکومت کے منصب سے ہٹایا تھا۔ ان میں پہلے سے موجود تھیں، اور وہ نئی کمزوریاں جو غلامی و افلاس کی حالت میں فطرۃً پیدا ہوتی ہیں، ان کے اندر تیزی سے پیدا ہو رہی تھیں۔ ان دونوں قسم کی کمزوریوں کی بدولت ایک طرف دین و اخلاق کی اہمیت اور قومی تہذیب و تمدن کی قدر و عزت روز بروز ان میں کم ہوتی چلی گئی، دوسری طرف خود غرضی و نفسانیت کے روز افزوں غلبہ نے

ان کو ہر اس شخص کی غلامی پر آمادہ کر دیا جو ان کو کچھ مال اور جاہ اور اپنے ہم جنسوں میں کچھ سربلندی عطا کر سکتا ہو خواہ ان چیزوں کے بدلہ میں وہ انسانیت کے جس گوہر بے بہا کو چاہے خرید لے۔ تیسری طرف انفرادیت اور خود پرستی جو ڈھائی سو برس سے ان کی قومیت کو گھن کی طرح لگی ہوئی ہے، انتہائی حد کو پہنچ گئی یہاں تک کہ اجتماعی عمل کی کوئی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہی، اور وہ تمام صفات ان سے نکل گئیں، جن کی بدولت ایک قوم کے افراد اپنے قومی مفاد کی حفاظت اور اپنے قومی وجود کی حمایت کے لئے مجتمع ہو سکتے اور مشترک جد و جہد کر سکتے ہیں۔

یہاں اتنا موقع نہیں کہ اس دوسرے انقلاب کے تمام پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا سکے۔ تاہم مختصراً اس کے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف ہم اشارہ کریں گے تاکہ ہندوستان میں اسلام کی موجودہ پوزیشن واضح طور پر سامنے آجائے اور یہ اندازہ کیا جا سکے کہ اب جو تیسرا انقلاب سامنے آرہا ہے، وہ ان حالات میں مسلمانوں پر کس طرح اثر انداز ہوگا۔

انگریزی حکومت کی پالیسی جس روز سے برٹش امپیریلزم نے ہندوستان میں قدم رکھا ہے، اسی روز سے اس کی یہ مستقل پالیسی رہی ہے کہ مسلمانوں کا زور توڑا جائے۔ اسی غرض کے لیے مسلمان ریاستوں کو مٹایا گیا اور اس نظامِ عدل و قانون کو بدلا گیا جو صدیوں سے یہاں قائم تھا۔ اسی غرض کے لیے انتظامِ مملکت کے قریب قریب ہر شعبے میں ایسی تدبیریں اختیار کی گئیں جن کا مآل یہ تھا کہ مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے تباہ و برباد کر دیا جائے اور ان پر رزق کے دروازے بند کر دیے جائیں۔ چنانچہ گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے اندر اس پالیسی کے جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ جو قوم کبھی اس ملک کے خزانوں کی مالک تھی وہ اب روٹیوں کو محتاج ہو چکی ہے۔ اس کو معیشت کے ذرائع سے ایک ایک کر کے محروم کر دیا گیا ہے، اور اب اس کی ۹۰ فی صدی آبادی غیر مسلم سرمایہ دار کی معاشی غلامی میں مبتلا ہے۔ ساہوکار سے برٹش امپیریلزم کا مستقل اتحاد ہے۔ اور برطانوی نظامِ عدالت اس کے لئے وہی خدمت انجام دے رہا ہے، جو سود خوار پٹھان کے لئے اس کا ڈنڈا انجام دیتا ہے۔

مغربی تعلیم کا اثر سیاسی اقتدار سے محروم ہونے کے بعد مسلمانوں میں جاہ اور عزت کی بھوک پیدا ہوئی اور معاشی وسائل سے محروم ہونے کے بعد روٹی کی بھوک۔ ان دونوں چیزوں کے حصول کا دروازہ صرف

ایک ہی رکھا گیا، اور وہ مغربی تعلیم کا دروازہ تھا۔ روٹی اور عزت کے بھوکے لاکھوں کی تعداد میں ادھر لپکے۔ وہاں ہاتف غیب نے پکار کر کہا کہ آج روٹی اور عزت مسلمان کے لئے نہیں ہے۔ یہ چیزیں اگر چاہتے ہو تو نامسلمان بن کر آؤ۔ اپنے دل کو، اپنے دماغ کو، اپنے دین اور اخلاق کو، اپنی تہذیب اور آداب کو، اپنے اصول حیات اور طرز معاشرت کو، اپنی غیرت اور خودداری کو قربان کرو، تب روٹی کے چند ٹکڑے اور عزت کے چند کھلونے تم کو دیئے جائیں گے۔ انھوں نے خیال کیا کہ بہت ہی سستے داموں بہت ہی قیمتی چیز مل رہی ہے۔ یہ جو اس کباڑ خانے کو۔ یہ چیزیں جو روٹی اور خطاب وسند جیسی بے بہا چیزوں کے معاوضے میں مانگی جا رہی ہیں، آخر میں کس کام کی؟ انھیں تو رہن رکھ کر بنیے سے چار پیسے بھی نہیں مل سکتے۔

مسلمان جب مغربی تعلیم کی طرف گئے تو یہی کچھ سمجھ کر گئے۔ زبانوں نے گو ایسا نہیں کہا، مگر جذبات اور تخیلات تو ایسے ہی کچھ تھے یہی وجہ ہے کہ کم وبیش ۹۰ فیصدی لوگوں پر اس تعلیم کے وہی اثرات ہوئے جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں۔ اسلامی تعلیم سے وہ قطعی کورے ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے ہیں جو قرآن کو ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ اسلامی لٹریچر کی کوئی چیز ان کی نظروں سے نہیں گذری۔ وہ کچھ نہیں جانتے کہ اسلام کیا ہے اور مسلمان کس کو کہتے ہیں۔ اور اسلام اور غیر اسلام میں کیا چیز مابہ الامتیاز ہے۔ خواہشات نفس کو انھوں نے اپنا معبود بنا لیا ہے۔ اور یہ معبود اس مغربی تہذیب کی طرف انھیں لئے جا رہا ہے جس نے نفس کی ہر خواہش اور لذت نفس کی ہر طلب کو پورا کرنے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ وہ مسلمان ہونے پر نہیں بلکہ ماڈرن ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ وہ اہل فرنگ کی ایک ایک ادا پر جان نثار کرتے ہیں۔ لباس میں، معاشرت میں، کھانے اور پینے میں، میل جول اور بات چیت میں، حتیٰ کہ اپنے ناموں تک میں وہ ان کا ہو بہو چربہ بن جانا چاہتے ہیں۔ انھیں ہر اس طریقہ سے نفرت ہے جس کا حکم مذہب نے ان کو دیا ہے، اور ہر اس کام سے رغبت ہے جس کی طرف مغربی تہذیب انھیں بلاتی ہے۔ نماز پڑھنا ان کے ہاں معیوب ہے، اتنا معیوب کہ جو شخص نماز پڑھتا ہے۔ ان کی سوسائٹی میں اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور اگر بنانے کی جرأت نہیں ہوتی تو کم از کم حقارت آمیز حیرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ آخر یہ کون سی مخلوق ہے جو اب تک خدا کا نام لئے جا رہی ہے۔ بخلاف اس کے سینما جانا ان کے نزدیک نہ صرف مستحسن بلکہ ایک مہذب انسان کے لوازم حیات میں سے ہو

اور جو شخص اس سے اجتناب کرتا ہے، اس پر حیرت کی جاتی ہے کہ یہ کس قسم کا تاریک خیال مُلّا ہے جو بیسویں صدی کی اس برکتِ عظمیٰ سے محروم رہنا چاہتا ہے۔ ان میں اب وہ طبقہ سرعت سے بڑھ رہا ہے جو مذہب اور خدا سے اپنی بیزاری کو چھپانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اور صاف کہنے لگا ہے کہ ہمیں اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ چیز اب تک ہمارے مردوں میں تھی، مگر اب عورتوں میں بھی پہنچ رہی ہے۔ جو طبقے ہماری سوسائٹی کے پیش رو اور مقتدا ہیں، وہ اپنی عورتوں کو کھینچ کھینچ کر باہر لا رہے ہیں، ان کو بھی اسلام اور اس کی تہذیب سے بیگانہ اور مغربی تہذیب اور اس کے طور طریقوں اور اس کے تخیلات سے آراستہ کیا جا رہا ہے۔ عورت میں انفعال اور تأثر کا مادہ فطری طور پر مردوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ جو راستہ مردوں نے ستر برس میں طے کیا ہے، عورتیں اس کو بہت جلد طے کر لیں گی اور ان کی گودوں میں جو نسلیں پرورش پا کر اٹھیں گی ان میں شاید اسلام کا نام بھی باقی نہ رہے گا۔

قومی انتشار خود غرضی، انفرادیت اور نفس پرستی کے غلبہ کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں سے قومیت کا احساس مٹتا جا رہا ہے، اور ان کی اجتماعی طاقت فنا ہو رہی ہے۔ پندرہ سال سے ان کے اندر سخت انتشار برپا ہے۔ ان کی کوئی قومی پالیسی نہیں، کوئی اجتماعی ہیئت نہیں، کوئی ایک شخص نہیں جو ان کا لیڈر ہو، کوئی ایک جماعت نہیں جو ان کی نمایندہ ہو، کسی بڑی سے بڑی مصیبت پر بھی وہ جمع نہیں ہو سکتے، ایک بن مری فوج ہے جو راس کماری سے پشاور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایک ریوڑ ہے جس میں کوئی نظم نہیں۔ ایک بھیڑ ہے جس میں کوئی رابطہ نہیں۔ ہر فرد آپ ہی اپنا لیڈر اور اپنا پیرو ہے۔ انجمنیں اور جمعیتیں ہزاروں ہیں، مگر حال یہ ہے کہ ایک ہی انجمن کے ارکان باہم برسرِ پیکار ہو جاتے ہیں، اور علانیہ ایک دوسرے کے مقابلہ پر آ جاتے ہیں۔ اول اول ان کو اپنی اس طاقت کا گھمنڈ تھا جو کبھی ان میں پائی جاتی تھی، مگر ہمسایہ قوموں نے دس سال کے اندر ان کو بتا دیا کہ طاقت کس چیز کا نام ہے۔ یہ آپس میں لڑتے رہے، اور وہ منظم ہو گئیں ——— انھوں نے خود اپنے سرداروں میں سے ایک ایک کو کھینچ کر زمین پر گرا دیا، اور انھوں نے ایک سردار کی اطاعت کر کے اسے تمام ملک میں بے تاج و تخت کا بادشاہ بنا دیا۔ ——— یہ اپنی قوتیں اپنی تخریب میں

ضائع کرتے رہے، اور وہ حکومت سے پیہم مقابلہ کر کے اپنا زور بڑھاتے رہے، ——— انھوں نے ملک کے تازہ انتخابات میں شخصی اغراض کو سامنے رکھا، اور بیسیوں پارٹیاں بن کر اسمبلیوں میں پہنچے۔ انھوں نے اجتماعی اغراض کو مقدم رکھکر تمام ملک میں منضبط جد وجہد کی اور ایک مستحکم جمعیت کی شکل میں حکومت کے ایوانوں پر قبضہ کر لیا۔ ان نتائج کو دیکھ کر ہندوستان کے مسلمانوں پر اب وہی اثر ہو رہا ہے، جو ایک باقاعدہ فوج کو دیکھ کر ایک منتشر انبوہ پر ہوا کرتا ہے، ایک منظم جماعت کی کامیابیوں سے وہ مرعوب ہو گئے ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ حکومت کا اقتدار اب بہت جلد انگریز کے ہاتھ سے منتقل ہو کر اس نئی جماعت کے ہاتھ میں آنے والا ہے۔ لہذا اب وہ سمت قبلہ بدلنے کی تیاریاں کر رہے ہیں، ان کے سجدوں کا رخ وائسریگل لاج سے ہٹ کر آنند بھون کی طرف پھرنے لگا ہے، اور آج نہیں تو کل پھر کر رہے گا۔

آنے والے انقلاب کی نوعیت یہ ہے مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن۔ اب دیکھئے کہ جو انقلاب آرہا ہے وہ کس نوعیت کا ہے۔

اب تک ہندوستان کی حکومت ایک ایسی قوم کے ہاتھ میں رہی ہے جو اس ملک کی آبادی میں آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے اثرات تو وہ تھے جو اوپر آپنے دیکھ لیے۔ اب جو جماعت برسر اقتدار آرہی ہے، وہ ملک کی آبادی کا سواد اعظم ہے۔ گذشتہ ڈھائی سو برس میں مسلمانوں نے جو زنانہ خصوصیات اپنے اندر پیدا کی ہیں، ان کو پیش نظر رکھ کر اندازہ کیجئے کہ ان کو جدید ہندی قومیت میں جذب ہونے میں کتنی دیر لگے گی۔

جدید ہندی قومیت کا لیڈر وہ شخص ہے، جو مذہب کا علانیہ مخالف ہے، ہر اس قومیت کا دشمن ہے جس کی بنا کسی مذہب پر ہو۔ اس نے اپنی دہریت کو کبھی نہیں چھپایا۔ یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ وہ کمیونزم پر ایمان رکھتا ہے۔ اس امر کا بھی وہ خود اعتراف کر چکا ہے، کہ میں دل اور دماغ کے اعتبار سے مکمل فرنگی ہوں۔ یہ شخص ہندوستان کی نوجوان نسل کا رہنما ہے، اور اس کے اثر سے وہ جماعت نہ صرف غیر مسلم قوموں میں، بلکہ خود مسلمانوں کی نوخیز نسلوں میں بھی روز افزوں تعداد میں پیدا ہو رہی ہے جو سیاسی حیثیت سے ہندوستانی وطن پرست اور اعتقادی حیثیت سے کمیونسٹ اور تہذیبی

حیثیت سے مکمل فرنگی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ڈھنگ پر جو قومیت تیار ہو رہی ہے۔ اس سے مغلوب اور متاثر ہو کر ہندوستان کے مسلمان کتنی مدت تک اپنی قومی تہذیب کے باقی ماندہ آثار کو زندہ رکھ سکیں گے۔

مسلمانوں کے انتشار اور بدنظمی کو دیکھ کر اب ان کے مستقل قومی وجود کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کیا جا رہا ہے۔ جن لوگوں کی عمریں عوام کی رہنمائی اور اقوام کی نبض شناسی میں گذری ہیں، ان سے یہ راز کب تک چھپا رہ سکتا تھا کہ اس قوم کا شیرازۂ قومیت بڑی حد تک بکھر چکا ہے، وہ خصوصیات اس سے فنا ہو رہی ہیں جو کسی جماعت کو ایک قوم بناتی ہیں اور اب اس کے افراد کسی دوسری قومیت میں جذب ہونے کے لئے کافی حد تک مستعد ہو چکے ہیں۔ یہی چیز ہے جس کی بنا پر اب یہ اسکیم بنائی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کی جماعتوں کو خطاب کرنے کے بجائے ان کے افراد کو خطاب کیا جائے۔ اور ان کو جدا جدا اکائیوں کی شکل میں رفتہ رفتہ اپنی طرف کھینچا جائے۔ یہ کس چیز کی تمہید ہے؟ جس شخص کو اللہ نے تھوڑی سی بصیرت بھی عطا کی ہے۔ وہ اس کو سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ مسلمان انگریزی اقتدار کے زمانہ میں جس کیرکٹر کا اظہار کرتے رہے ہیں اس کو سامنے رکھ کر غور کیجئے۔ کیا اسمبلیوں کی نشستوں اور آئندہ معاشی اور سیاسی فائدوں کا لالچ ان کے افراد کو فوج در فوج اس طرف کھینچ کر نہ لے جائے گا جس طرف انھیں کھینچا جا رہا ہے؟ اور کیا یہ وہی سب کچھ نہ کریں گے جو انگریزی اقتدار کی غلامی میں کر چکے ہیں؟

مسلمانوں کی اصلی کمزوری کو تاڑ لیا گیا ہے۔ آپنے سنا کہ انھیں کھینچنے کے لئے جو صدا بلند کی جا رہی ہے وہ کون سی صدا ہے؟ وہی پیٹ اور روٹی کی ذلیل صدا جو ہمیشہ خود غرض اور شکم پرست حیوانات کو اپنی طرف کھینچتی رہی ہے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ تہذیب کیا بلا ہے؟ اور تمہاری تہذیب کی خصوصیت بجز پاجامے اور داڑھی اور لوٹے کے اور ہے ہی کیا؟ اس میں آخر کونسی اہمیت ہے؟ اصلی سوال تو پیٹ کا سوال ہے، اسی سوال کو حل کرنے کے لئے ہم اٹھے ہیں، اب اگر دہریت اور کمیونزم کا زہر بھی تھوڑا تھوڑا ہر نوالے کے ساتھ پیٹ میں اتر جائے، تو اس سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں، جو قوم اس سے پہلے انہی نوالوں کے ساتھ الحاد اور فرنگیت کا زہر بھی اتار چکی ہے۔ اس کے حلق میں ویسی ہی چند اور چٹنیاں کیوں پھنسنے لگیں؟

جدید انقلابی دور کی ابتدائی علامتیں اس نوعیت کا ہے وہ انقلاب جو اب آرہا ہے۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ اس انقلاب کے دامن سے وابستہ ہیں، ان کی زندگیاں ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی صورتیں، ان کے لباس، ان کی بات چیت، ان کی چال ڈھال، ان کے آداب و اطوار، ان کے خیالات سب کچھ ہمارے سامنے اس مسلمان کا نمونہ پیش کر رہے ہیں، جو اس آنے والے انقلاب میں پیدا ہوگا۔ ہم ابھی سے دیکھ رہے ہیں، کہ مسٹروں کے بجائے شری یُت اور مسوں کے بجائے شریمتیاں ہمارے ہاں پیدا ہونے لگی ہیں۔ گڈمارننگ کی جگہ ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا جانے لگا ہے، ہیٹ کی جگہ گاندھی کیپ لے رہی ہے، اور بعض علمائے دین فتویٰ دے رہے ہیں کہ یہ تشبّہ کی تعریف سے خارج ہے۔ غرض دماغ اور دل اور جسم سب اپنا رنگ بدل رہے ہیں۔ اور كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ کی لعنت جو ان پر ستر سال پہلے نازل ہوئی تھی اب ایک دوسری شکل اختیار کر رہی ہے۔

انقلاب کی تیز رفتاری دنیا میں انقلاب کی رفتار بہت تیز ہے اور روز بروز تیز ہوتی چلی جارہی ہے پہلے جو تغیرات صدیوں میں ہوا کرتے تھے، اب وہ برسوں میں ہو رہے ہیں۔ پہلے انقلاب بیل گاڑیوں اور ٹٹوؤں پر سفر کیا کرتا تھا، اب ریل اور تار اور اخبار اور ریڈیو پر حرکت کر رہا ہے۔ آج وہ حالت ہے کہ

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

اگر ہندوستان کے باہر کوئی اچانک واقعہ نہ بھی پیش آیا تب بھی اس متوقع انقلاب کے رونما ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگے گی، اور کوئی عالمگیر جنگ چھڑ گئی جو قضائے مبرم کی طرح دنیا کے سر پر لٹک رہی ہے۔ تو غالباً فیصلہ کا وقت اور بھی زیادہ قریب آجائے گا۔

حالات کا جائزہ اور آیندہ کے امکانات

پچھلے باب میں ہم نے محض سرسری طور پر مسلمانوں کو اس انقلاب سے آگاہ کیا تھا، جو عنقریب ہندوستان میں رونما ہونے والا ہے اور جس کے آثار اب پوری طرح نمایاں ہو چکے ہیں ——— ہمارا اصل مقصد مسلمانوں کو اس نئے آنے والے انقلاب میں اپنے قومی تشخص اور اپنی تہذیب کی حفاظت کے لئے تیار کرنا ہے، مگر یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی موجودہ پوزیشن اور اس جدید انقلاب کو اچھی طرح سمجھ نہ لیں، اور یہ نہ جان لیں کہ اس پوزیشن میں اس نوعیت کا انقلاب ان کی قومی تہذیب پر کس طرح اثر انداز ہوگا؟ اور اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

مسلمانوں کی چار بنیادی کمزوریاں

پچھلی صحبت میں ہم مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن پر ایک سرسری تبصرہ کر چکے ہیں، جس سے اجمالاً آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ اجتماعی حیثیت سے اس وقت مسلمانوں میں کس قسم کی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن آگے جو کچھ ہم کو کہنا ہے، اس کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ واضح طور پر ان چار اہم ترین کمزوریوں سے واقف ہو جائیں، جو مسلمانوں کی قومی طاقت کو گھن کی طرح کھا گئی ہیں اور درحقیقت انہی کی وجہ سے یہ سوال پیدا بھی ہوا ہے کہ آنے والے انقلاب میں کیا مسلمان اپنی اسلامی تہذیب کی حفاظت کر سکیں گے۔ ورنہ اگر یہ کمزوریاں نہ ہوتیں تو کسی مسلمان کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

پہلی اور اہم ترین کمزوری

مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان کا سواد اعظم اسلامی تہذیب اور اس کی اسلامی خصوصیات سے ناواقف ہے حتیٰ کہ اس میں ان حدود کا شعور تک باقی نہیں رہا ہے جو اسلام کو غیر اسلام سے ممیز کرتی ہیں۔ اسلامی تعلیم، اسلامی تربیت اور جماعت کا ڈسپلن تقریباً مفقود ہو چکا ہے۔ ان کے افراد منتشر طور پر ہر قسم کے بیرونی اثرات کو قبول کر رہے ہیں، اور جماعت اپنی کمزوری کی بنا پر بتدریج ان اثرات کو اپنے اندر جذب کرتی چلی جاتی ہے ——— ان کا قومی کیرکٹر اب مردانہ کیرکٹر نہیں رہا

بلکہ زمانہ کیرکٹر بن گیا ہے جس کی نمایاں خصوصیت تاثر و انفعال ہے ـــــــ ہر طاقت ور ان کے خیالات کو بدل سکتا ہے، ان کے عقائد کو پھیر سکتا ہے، ان کی ذہنیت کو اپنے سانچے میں ڈھال سکتا ہے، ان کی زندگی کو اپنے رنگ میں رنگ سکتا ہے، ان کے اصولِ حیات میں اپنی مرضی کے مطابق جیسا چاہے تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ اوّل تو وہ اتنا علم ہی نہیں رکھتے کہ یہ امتیاز کر سکیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کس خیال اور کس عملی طریقے کو قبول کر سکتے ہیں، اور کس کو قبول نہیں کر سکتے۔ دوسرے ان کی قومی تربیت اتنی ناقص ہے کہ ان کے اندر کوئی اخلاقی طاقت ہی باقی نہیں رہی۔ جب کوئی چیز قوت کے ساتھ آئی اور گرد و پیش میں پھیل جاتی ہے، تو خواہ وہ کتنی ہی غیر اسلامی ہو، یہ اس کی گرفت سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے اور غیر اسلامی جاننے کے باوجود طوعاً و کرہاً اس کے آگے سپر ڈال ہی دیتے ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ نظامِ جماعت حد سے زیادہ مضمحل ہو چکا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں اتنی قوت ہی نہیں رہی کہ وہ اپنے افراد کو حدودِ اسلامی کے باہر قدم رکھنے سے باز رکھ سکے، یا اپنے دائرے میں غیر اسلامی خیالات اور طریقوں کی اشاعت کو روک سکے۔ افراد کو قابو میں رکھنا تو درکنار ہماری سوسائٹی تو اب افراد کے پیچھے چل رہی ہے۔ پہلے چند سرکش افراد اسلامی قانون کے خلاف بغاوت کرتے ہیں، سوسائٹی چند روز اس پر ناک بھوں چڑھاتی ہے، پھر دیکھتے دیکھتے وہی بغاوت ساری قوم میں پھیل جاتی ہے۔

دوسری کمزوری انفرادیت اور لامرکزیت کی روز افزوں ترقی نے مسلمانوں کے شیرازۂ قومیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے، اور اجتماعی عمل کی کوئی صلاحیت اب ان میں نہیں پائی جاتی۔ شخصی اغراض اور ذاتی مفاد کی بنیاد پر جماعتیں بنتی ہیں، اور پھر خود غرضی کی چٹان ہی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ کوئی بڑی سے بڑی قومی مصیبت بھی آج مسلمانوں کے رہنماؤں اور ان کے قومی کارکنوں کو اتحادِ عمل اور مخلصانہ اور بے غرضانہ عمل پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ تحریکِ خلافت کی ناکامی کے بعد سے مسلسل مصیبتیں مسلمانوں پر نازل ہوئیں پیہم خطرات ان کے سامنے آئے۔ مگر کوئی ایک چیز بھی ان کو اشتراکِ عمل کے لئے جمع نہ کر سکی۔ تازہ ترین واقعہ مسجد شہید گنج کا ہے جس نے اس قوم کی کمزوری کا راز اپنوں سے زیادہ غیروں پر فاش کر دیا۔ ان کے اندر اتنی زندگی تو ضرور باقی ہے کہ جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے، تو تڑپ اٹھتے ہیں،

گروہ اخلاقی اوصاف باقی نہیں جن کی بدولت یہ قومی مفاد کی حفاظت کے لئے اجتماعی کوشش کر سکیں۔ ان میں اتنی تمیز نہیں کہ صحیح رہنما کا انتخاب کر سکیں۔ ان میں اطاعت کا مادہ نہیں کہ کسی کو رہنما تسلیم کرنے کے بعد اس کی بات کو مانیں اور اس کی ہدایت پر چلیں۔ ان میں اتنا ایثار نہیں کہ کسی بڑے مقصد کے لئے اپنے ذاتی مفاد، اپنی ذاتی رائے، اپنی آسایش، اپنے مال اور اپنی جان کی قربانی کسی حد تک بھی گوارا کر سکیں۔

تیسری کمزوری — افلاس، جہالت اور غلامی نے ہمارے افراد کو بے غیرت اور بندۂ نفس بنا دیا ہے۔ وہ روٹی اور عزت کے بھوکے ہو رہے ہیں۔ ان کا حال یہ ہو گیا ہے کہ جہاں کسی نے روٹی کے چند ٹکڑے، اور نام و نمود کے چند کھلونے پھینکے، یہ کتوں کی طرح ان کی طرف لپکتے ہیں، اور ان کے معاوضے میں اپنے دین و ایمان، اپنے ضمیر، اپنی غیرت و شرافت، اپنی قوم و ملت کے خلاف کوئی خدمت بجا لانے میں ان کو باک نہیں ہوتا۔ مسلمان کا ایمان جو کبھی سارے جہان کی دولت سے بھی زیادہ قیمتی تھا، آج اتنا سستا ہو گیا ہے کہ ایک حقیر سی تنخواہ اسے خرید سکتی ہے، ایک ادنیٰ درجہ کی کرسی پر وہ قربان ہو سکتا ہے، ایک آبرو باختہ عورت کے قدموں پر وہ نثار کیا جا سکتا ہے، ایک خطاب یا ذرا سی شہرت عطا کر کے یا دو چار جے کے نعرے لگا کر اس کو خرید لیا جا سکتا ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ سو برس کا تجربہ بتا رہا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنوں نے جو کچھ کرنا چاہا، اس کے لئے خود مسلمانوں ہی کی جماعت سے ایک دو نہیں ہزاروں اور لاکھوں خائن اور غدار ان کو مل گئے جنھوں نے تقریر سے، تحریر سے، ہاتھ اور پاؤں سے حتیٰ کہ تلوار اور بندوق تک سے اپنے مذہب اور اپنی قوم کے مقابلہ میں دشمنوں کی خدمت کی۔ یہ ناپاک اور ذلیل ترین وصف جب ہمارے افراد میں موجود ہے تو جس طرح چھ ہزار میل دور کے رہنے والوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، اسی طرح ہم سے ایک دیوار بیچ رہنے والے بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور اگر ہماری فاش گوئی کسی کو بُری نہ معلوم ہو تو ہم صاف کہہ دیں کہ انھوں نے اس سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ پرانی مارکیٹ میں جب سے سرد بازاری کے آثار نمایاں ہوئے ہیں، نئی مارکیٹ میں ایمان کی خرید و فروخت کا بیوپار بڑھ رہا ہے۔

——— ہمارے کان خود اپنی قوم کے لوگوں کی زبان سے جب کمیونزم کا پروپیگنڈا سنتے ہیں، متحدہ ہندی قومیت میں جذب ہو جانے کی دعوت سنتے ہیں، اور یہ آوازیں سنتے ہیں کہ اسلامی کلچر کوئی جداگانہ

کلچر ہی نہیں ہے۔ تو ہمارا حافظہ ہم کو یاد دلاتا ہے، کہ کچھ اسی نوعیت کی آوازیں اُس وقت بھی بلند ہونی شروع ہوئی تھیں، جب سرکار برطانیہ کی غلامی کا زریں پھندا ہمارے گلوں میں پڑ رہا تھا۔

چوتھی کمزوری ہماری قوم میں منافقین کی ایک بڑی جماعت شامل ہے۔ اور اس کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ بکثرتِ اشخاص، تعلیم یافتہ، صاحبِ قلم، صاحبِ زبان، صاحبِ مال وزر، صاحبِ اثر اشخاص ایسے ہیں جو دل سے اسلام اور اس کی تعلیمات پر یقین نہیں رکھتے، مگر نفاق اور قطعی بے ایمانی کی راہ سے مسلمانوں کی جماعت میں شریک ہیں۔ یہ اسلام سے عقیدۃً اور عملاً نکل چکے ہیں، مگر اس سے براءت کا صریح اعلان نہیں کرتے، اس لئے مسلمان ان کے ناموں سے دھوکہ کھا کر انھیں اپنی قوم کا آدمی سمجھتے ہیں، ان سے شادی بیاہ کرتے ہیں، ان سے معاشرت کے تعلقات رکھتے ہیں، اور ان زہریلے جانوروں کو اپنی جماعت میں چل پھر کر اور رہ بس کر زہر پھیلانے کا موقع دے رہے ہیں۔ نفاق کا خطرہ ہر زمانے میں مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ رہا ہے، مگر اس نازک زمانہ میں تو یہ ہمارے لئے پیامِ موت ہے۔ انکھیں کھول کر دیکھئے کہ یہ منافقین کیسا مہلک زہر ہماری قوم میں پھیلا رہے ہیں۔ یہ اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں، اس کی اساسی تعلیمات پر حملے کرتے ہیں، مسلمانوں کو دہریت اور الحاد کی طرف دعوت دیتے ہیں، ان میں بے دینی اور بےحیائی اور قانونِ اسلامی کی خلاف ورزی کو نہ صرف عملاً پھیلاتے ہیں، بلکہ کھلم کھلا زبان و قلم سے اس کی تبلیغ کرتے ہیں، ان کی تہذیب کو مٹانے کی ہر کوشش میں آپ دیکھیں گے کہ یہ دشمنوں سے چار قدم آگے ہیں۔ ہر وہ اسکیم جو اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کے لئے کہیں سے نکلی ہو، اس کو مسلمانوں کی جماعت میں نافذ کرنے کی خدمت یہی ناپاک گروہ اپنے ذمہ لیتا ہے۔ اور اسلامی قومیت کا ایک جزء ہونے کی وجہ سے اس کو اپنا کام کرنے کا خوب موقع مل جاتا ہے۔[1]

یہ حالت ہے اس وقت ہماری قوم کی، اور اس حالت میں یہ ایک بڑے انقلاب کے سرے پر کھڑی ہے۔ انقلاب کی فطرت بحرانی اور طوفانی فطرت ہوتی ہے۔ وہ جب آتا ہے تو آندھی اور سیلاب کی طرح آتا ہے، اس کے زور کا مقابلہ اگر کچھ کر سکتی ہیں تو مضبوط جمی ہوئی چٹانیں ہی کر سکتی ہیں۔

---

[1] بلکہ اب تو چشم بد دور مسلمانوں کے رہنما اور اسلامی تہذیب کے محافظ بھی ایسے ہی لوگ ہیں۔

بوسیدہ عمارتیں جو اپنی جڑ چھوڑ کر محض فضا کے سکون و جمود کی بدولت کھڑی ہوں، ان کا کسی انقلابی طوفان میں ٹھیرنا غیر ممکن ہے۔ اب جو کوئی صاحبِ بصیرت انسان اس وقت مسلمانوں کی حالت پر نگاہ ڈالے گا۔ وہ بیک نظر معلوم کرے گا کہ ان کمزوریوں کے ساتھ یہ قوم ہرگز کسی انقلاب کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے انقلابی دَور میں اپنے قومی تشخص اور اسلامی تہذیب کے خصائص کو بچائے جانا، اور اپنے آپ کو پامالی سے محفوظ رکھنا بہت ہی مشکل ہے۔ اول تو جہالت کی بنا پر بہت سے اجنبی اثرات کو بے جانے بوجھے قبول کرے گی۔ پھر زمانہ کیرکٹر اس کو بہت سی ایسی چیزوں سے متاثر کر دے گا جن کو وہ جانتی ہوگی کہ اسلامی تعلیمات کے خلاف اور اسلامی تہذیب کے منافی ہیں۔ اس طرح ایک بڑی حد تک تو بلا مقابلہ ہی شکست واقع ہوگی۔ اس کے بعد جو تھوڑے بہت احساسات باقی رہ جائیں گے، وہ اگر کسی شدید حملے پر بیدار بھی ہوئے، اور اس قوم نے اپنے وجود کی حفاظت کرنی بھی چاہی تو نہ کر سکے گی، کیونکہ اپنی بدنظمی اور انتشار کی بدولت اس کے لئے کوئی متحدہ جدوجہد کرنا مشکل ہوگا، اور اسی کے گروہ سے ہزاروں لاکھوں خائن غدار اور منافق اس کے قومی وجود کو پامال کرانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

جدید انقلابی قوتوں پر ایک نظر مسلمانوں کی حالت کا جائزہ آپ لے چکے۔ اب آیندہ انقلاب کے نتائج کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ان قوتوں کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے جو اس انقلابی تحریک میں کام کر رہی ہیں۔

ہندوستان کی جدید وطنی حرکت دراصل نتیجہ ہے اس تصادم کا جو انگریزی اقتدار اور ہندوستان کے درمیان گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہو رہا ہے۔ یہ تصادم محض سیاسی نہیں ہے، بلکہ فکری اور عمرانی بھی ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ فکری اور عمرانی تصادم کا جو نتیجہ ہوا ہے وہ سیاسی تصادم کے نتیجہ سے بالکل برعکس ہے۔ انگریزی سیاست کے جور و استبداد اور معاشی لوٹ نے تو ہندوستان کے باشندوں کو آزادی کا سبق دیا، اور ان میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ بندِ غلامی کو توڑ کر پھینک دیں، لیکن انگریزی علوم و فنون اور انگریزی تہذیب و تمدن نے ان کو پوری طرح مغرب کا غلام بنا دیا، اور ان کے دماغوں پر اتنا زبردست قابو پا لیا کہ اب وہ زندگی کا کوئی نقشہ اس نقشہ کے خلاف نہیں سوچ سکتے جو ان کے سامنے اہلِ مغرب نے پیش کیا ہے۔ وہ جس قسم کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اس کی نوعیت صرف یہ ہے کہ ہندوستان سیاسی حیثیت سے

آزاد ہو، اپنے گھر کا انتظام آپ کرے، اور اپنے وسائل معیشت کو خود اپنے مفاد کے لئے استعمال کرے۔ لیکن یہ آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر کے انتظام اور اپنی زندگی کی تعمیر کا جو نقشہ ان کے ذہن میں ہے، وہ از سرتاپا فرنگی ہے، ان کے پاس جتنے اجتماعی تصورات ہیں، جس قدر عمرانی اصول ہیں سب کے سب مغرب سے حاصل کئے ہوئے ہیں۔ ان کی نظر فرنگی نظر ہے، ان کے دماغ فرنگی دماغ ہیں، ان کی ذہنیت پوری طرح فرنگیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ بلکہ انقلابیت کے بحران نے ان کو (یا کم از کم ان کے سب سے زیادہ پرجوش طبقوں کو) فرنگیوں میں سے بھی اس قوم کا متبع بنا دیا ہے، جو انتہا پسندی میں تمام فرنگی اقوام کو پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ وہ پکے مادہ پرست ہیں۔ ان کی نگاہ میں اخلاق و روحانیت کی کوئی قیمت نہیں۔ ان کو خدا پرستی سے نفرت ہے۔ مذہب کو وہ شر و فساد کا ہم معنی سمجھتے ہیں۔ مذہبی اور اخلاقی قدروں کو وہ پر کاہ کے برابر بھی وقعت دینے کے لئے تیار نہیں۔ ان کو ہر ایسی قومیت اور ہر ایسے قومی امتیاز سے چڑھ ہے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ وہ زیادہ سے زیادہ رواداری جو مذہب کے ساتھ برت سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اس کو اپنی عبادت گاہوں اور اپنے مراسم میں جینے دیں۔ باقی رہی اجتماعی زندگی تو اس میں مذہب اور مذہبیت کے ہر اثر کو مٹانا ان کا نصب العین ہے، اور ان کے نزدیک اس اثر کو مٹائے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں۔ ہندوستانی قومیت کا جو نقشہ ان کے پیش نظر ہے، اس میں مذہبی جماعتوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ وہ تمام امتیازی حدود کو توڑ کر وطنیت کی بنیاد پر ایک ایسی قوم بنانا چاہتے ہیں جس کی اجتماعی زندگی ایک ہی طرز پر تعمیر ہو اور وہ طرز اپنے اصول و فروع میں خالص مغربی ہو۔

کمزوریوں کے ساتھ انقلابی تحریک میں شامل ہونے کے نتائج

چونکہ اس جماعت کے مقاصد میں سیاسی آزادی کا مقصد سب سے مقدم ہے۔ اور وہی اس وقت حالات کے لحاظ سے نمایاں ہو رہا ہے، اس لئے مسلمانوں کے آزادی پسند طبقے اس کی طرف کھنچ رہے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریز کی غلامی ہندوستان کے تمام باشندوں کے لئے ایک مشترک مصیبت ہے، اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے مشترک جد وجہد کرنا ہر آئینہ معقول ہے، اور جو گروہ اس جد وجہد میں سب سے زیادہ سرگرم ہو، اس کی طرف دلوں کا مائل ہونا اور اس کے ساتھ شریک عمل ہو جانا بظاہر ضروری نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

ہندوستان کے علماء اور سیاسی رہنماؤں میں سے ایک بڑی جماعت اور مخلص جماعت کانگریس کی طرف جارہی ہے اور عامۂ مسلمین کو بھی ترغیب دے رہی ہے کہ اس میں شریک ہوجائیں لیکن عمل کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے ایک مرتبہ اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

مسلمانوں کی جو کمزوریاں ہم نے اوپر بیان کی ہیں وہ سب آپ کے سامنے ہیں۔ ان کو پیش نظر رکھ کر غور کیجیے کہ ان کمزوریوں کے ساتھ جب یہ قوم کانگرس میں شریک ہوگی اور اس کے عوام سے کانگرسی کارکنوں کا رابطہ قائم ہوگا تو آزادی وطن کی تحریک کے ساتھ ساتھ اور کس کس قسم کی تحریکیں ان کے درمیان پھیلیں گی، کس کس طرح مسلمانوں کے عوام ان اجتماعی نظریات، ان ملحدانہ افکار، اور ان غیر اسلامی طریقوں سے متاثر ہوں گے جو اس جماعت میں شائع و ذائع ہیں، کس طرح اسلامی جماعت کے رگ و ریشہ میں اس فکری و عمرانی انقلاب کے عناصر پھیلائے جائیں گے جو سیاسی انقلاب کے ساتھ ہم رشتہ ہے؛ کس طرح مسلمانوں کے اندر ایک ایسی رائے عام تیار کرنے کی کوشش کی جائے گی جو علی رغم انف علماء و زعماء، جدید ترین مغربی و اشتراکی بنیادوں پر اجتماعی زندگی کی تعمیر کے ہر نقشہ کی تائید کرنے والی ہو، کس طرح مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے خود مسلمانوں کی جماعت سے وہ لوگ تیار کیے جائیں گے جو اسلامی کلچر کے خلاف ہر قسم کے طریقے رائج کرنے اور ہر قسم کے قوانین وضع کرنے میں حصہ لیں گے؟ ان حالات میں آپ کے پاس کون سی قوت ہے جس سے آپ اپنی قوم کو قابو میں رکھ سکیں گے؟ آپ نے اپنے عوام کو اسلامی تہذیب کے حدود میں رکھنے کا کیا بندوبست کیا ہے؟ آپ نے ان کو غیر اسلامی اثرات سے بچانے کا کیا انتظام کیا ہے؟ آپ نے اپنے غداروں اور منافقوں کے فتنے کا کیا علاج سوچا ہے؟ آپ کے پاس یہ اطمینان کرنے کا کونسا ذریعہ ہے کہ کسی سخت وقت میں آپ اسلامی مقاصد کی خدمت کے لیے مسلمانوں کو جمع کرسکیں گے اور ان کی متحدہ طاقت آپ کی پشت پر ہوگی؟

باطل کی جگہ باطل قائم کرنا مسلمان کا کام نہیں

انگریز کے اقتدار کا خاتمہ کرنا یقیناً ضروری ہے، بلکہ فرض ہے۔ کوئی سچا مسلمان غلامی پر ہرگز راضی نہیں ہوسکتا۔ جس شخص کے دل میں ایمان ہوگا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہ چاہے گا کہ ہندوستان انگریز کے پنجۂ استبداد میں رہے۔ لیکن آزادی کے جوش میں یہ نہ بھول جائیے کہ انگریزی اقتدار کی مخالفت میں مسلمان کا نظریہ ایک وطن پرست کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے۔ اگر آپ کو انگریز سے

اس لیے عداوت ہے کہ وہ انگریز ہے، چھ ہزار میل دور سے آیا ہے، آپ کے وطن کا رہنے والا نہیں ہے، تو یہ اسلامی عداوت نہیں بلکہ جاہلی عداوت ہے۔ اور اگر آپ اس سے اس لیے عداوت رکھتے ہیں کہ وہ غیر صالح ہے، ناجائز طریقے سے حکومت کرتا ہے، عدل کے بجائے جور پھیلاتا ہے، اصلاح کی جگہ فساد کرتا ہے، تو یہ بلاشبہ اسلامی عداوت ہے۔ لیکن اس لحاظ سے آپ کو دوستی اور دشمنی کا معیار اصول کو قرار دینا پڑے گا نہ کہ وطنیت کو۔ جو کچھ انگریز کرتا ہے، اگر وہی کچھ دوسرے کریں، تو آپ محض اس بنا پر ان کی حمایت نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے ہم وطن ہیں۔ مسلمان کی نگاہ میں وطنی اور غیر وطنی کوئی چیز نہیں۔ وہ غیر ملک کے صہیب اور سلمان کو گلے لگا سکتا ہے مگر اپنے وطن کے ابوجہل اور ابولہب سے دوستی نہیں کر سکتا۔ پس اگر آپ مسلمان ہیں تو وطنیت کے ڈھنگ پر نہ سوچیے بلکہ حق پرستی کے ڈھنگ پر سوچیے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا ضرور آپ کا فرض ہے، مگر کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار بننا آپ کے لیے ہرگز جائز نہیں جس کی بنیاد انہی اصولوں پر ہو جن پر انگریزی حکومت کی بنیاد قائم ہے، عام اس سے کہ وہ وطنی حکومت ہو یا غیر وطنی۔ آپ کا کام باطل کو مٹا کر حق کو قائم کرنا ہے، ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل اور بدتر باطل کو قائم کرنا نہیں ہے۔ آپ انگریزی حکومت کے خلاف ہر اس گروہ سے موالات کیجیے جو اس کو مٹانا چاہتا ہو۔ مگر یہ بتائیے کہ اس ظالم حکومت کو مٹا کر ایک عادل حکومت قائم کرنے کے لیے آپ نے کیا انتظام کیا ہے؟ کون سی طاقت آپ نے فراہم کی ہے جس سے آپ دوسری حکومت کی تشکیل حق کے اصولوں پر کرا سکیں؟ یہ نہیں تو جانے دیجیے، یہی بتا دیجیے کہ آپ نے خود اپنی قوم کو باطل کے اثرات سے بچانے کا کیا بندوبست فرمایا ہے؟

کیا آئینی ضمانتیں اور تحفظات کافی ہو سکتے ہیں؟

آپ کہتے ہیں کہ ہم اپنی تہذیب اور اپنے قومی طریقوں کی حفاظت کے لیے آئینی ضمانتیں لیں گے، ہم دستورِ اساسی میں ایسے تحفظات رکھوائیں گے جن سے اسلامی مفاد پر آنچ نہ آنے پائے۔ بلاشبہ یہ سب کچھ آپ کر سکتے ہیں۔ مگر شاید آپ نے غور نہیں فرمایا کہ آئینی ضمانتیں اور دستورِ اساسی کے تحفظات اور دستخط نامے کاغذی مواثیق صرف اسی قوم کے لیے مفید ہو سکتے ہیں جس میں ایک طاقت ور رائے عام موجود ہو جو آپ کو سمجھتی ہو، اپنی تہذیب کو جانتی ہو، اس کی خصوصیات کو پہچانتی ہو، اس کی حفاظت کا

ناقابل تسخیر ارادہ رکھتی ہو اور منفرداً و مجتمعاً اس کی طرف سے مدافعت کے لیے ہر وقت سینہ سپر ہو۔ یہ صفات اگر آپ کی قوم میں موجود ہیں تو آپ کو کسی آئینی ضمانت اور کسی دستوری تحفظ کی بھی ضرورت نہیں۔ اور اگر آپ کی قوم ان صفات سے عاری ہے تو یقین رکھیے کہ کوئی ضمانت اور کوئی تحفظ ایسی حالت میں کارآمد نہیں ہو سکتا۔ آپ دستور اساسی کی ضمانتوں کو زیادہ سے زیادہ خارجی حملوں کے مقابلہ میں استعمال کر سکتے ہیں، مگر اندرونی انقلاب کا آپکے پاس کونسا علاج ہے؟ مثال کے طور پر فرض کیجیے کہ کل مخلوط تعلیم شروع ہوتی ہے اور آپ کی قوم کے افراد خود اپنی مرضی سے دھڑا دھڑ اپنی لڑکیوں اور لڑکوں کو مخلوط مدارس میں بھیجتے ہیں۔ کونسا دستوری تحفظ اس تحریک کو اور اس کے زہریلے نتائج کو روکنے کے لیے استعمال کیا جائے گا؟ فرض کیجیے کہ سول میرج کے طریقہ پر نکاحوں کا رواج پھیلتا ہے اور آپ کی قوم خود اس تحریک سے متاثر ہو جاتی ہے۔ کونسی آئینی ضمانت اس کی روک تھام کر سکے گی؟ فرض کیجیے کہ آپ کی اپنی قوم میں پروپیگنڈا کی قوت اور تعلیم کے وسائل سے ایک ایسی رائے عام تیار کر دی جاتی ہے جو قوانین اسلامی میں ترمیم و تنسیخ پر راضی ہو بلکہ مصر ہو۔ آپ کی اپنی قوم کے افراد ایسے قوانین کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو اصول اسلام کے خلاف ہوں۔ خود آپ ہی کے ووٹوں کی اکثریت سے ایسی تجویزیں پاس ہو جاتی ہیں جو آپکے تمدن کو اسلامی مناہج سے ہٹا دینے والی ہوں۔ وہ کون سے "بنیادی حقوق" ہیں جن کا واسطہ دے کر آپ ان چیزوں کو منسوخ کرا سکیں گے؟ فرض کیجیے کہ آپ کی قوم تدریج ہمسایہ قوم کے طرز معاشرت، آداب و اطوار، عقائد و افکار کو قبول کرنا شروع کرتی ہے اور اپنے قومی امتیازات کو خود بخود مٹانے لگتی ہے۔ کونسا کاغذی میثاق اس تدریجی انجذاب کی روک تھام کر سکے گا؟ آپ اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سب تمہارے خیالی مفروضات ہیں۔ اس لیے کہ جو مسلمان اس وقت وطنی تحریک میں شامل ہیں ان کے نمونے آپ کے سامنے موجود ہیں۔ دیکھ لیجیے کہ ان کا طرز عمل انگریز کے غلاموں سے کچھ بھی مختلف نہیں، وہی ذہنی غلامی، وہی ذہنی انفعال و تاثر، وہی انجذابی کیفیت یہاں بھی نمایاں ہے جو آستانۂ فرنگ کے طائفین و عاکفین میں نظر آتی ہے۔ پھر جب اپنی قوم کی کمزوری اور اس کی موجودہ مزاجی کیفیت کے یہ کھلے ہوئے علائم اور آثار آپ کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں تو

آخر کس بھروسے پر آپ ساری قوم کو ادھر لے جانا چاہتے ہیں؟ فرمایئے تو سہی کہ آپ نے باطنی انقلاب اور تدریجی انجذاب کو روکنے کے لیے کونسا تحفظ کیا ہے؟

عوام کا جمود اور سیاسی جماعتوں کی بے راہ رویاں

مسلمانوں میں اس وقت زیادہ تر تین گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ آزادیٔ وطن کیلیے بے چین ہے اور کانگریس کی طرف کھنچ رہا ہے یا کھنچ گیا ہے۔ دوسرا گروہ اپنی قومی تہذیب اور اپنے قومی حقوق کی حفاظت کے لیے انگریز کی گود میں جانا چاہتا ہے اور آئندہ انقلاب کے خطرات سے بچنے کی یہی صورت مناسب سمجھتا ہے کہ سرکار برطانیہ کا معاون بن کر آزادی کی تحریک کو روکے۔ تیسرا گروہ عالم حیرت میں کھڑا ہے اور خاموشی کے ساتھ واقعات کو دیکھ رہا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تینوں گروہ غلطی پر ہیں۔ پہلے گروہ کی غلطی ہم نے اوپر واضح کردی۔ دوسرے گروہ کی غلطی بھی کچھ کم خطرناک نہیں۔ یہ لوگ اپنی کمزوریوں کی اصلاح کرنے کے بجائے دوسروں کی ترقی کو روکنا چاہتے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کے ضعف کی تلافی غیروں کے سہارے سے ہوجائے گی۔ ایسی ذلیل پالیسی دنیا میں نہ کبھی کامیاب ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ جو قوم خود زندہ رہنے کی طاقت نہ رکھتی ہو جس میں خود اپنے موقف پر کھڑے رہنے کا بل بوتا نہ ہو، وہ کب تک دوسروں کے سہارے جی سکتی ہے؟ کب تک کوئی سہارا اس کے لیے قائم رہ سکتا ہے؟ کب تک زمانے کے انقلابات اس کی خاطر رکے رہ سکتے ہیں؟ انگریز قیامت تک کے لیے ہندوستان پر حکومت کرنے کا پٹہ لکھوا کر نہیں لایا ہے۔ ہر قوم کے لیے ایک مدت ہوتی ہے انگریز کے لیے بھی بہرحال ایک مدت ہے، اور وہ آج نہیں تو کل پوری ہوگی۔ اس کے بعد وہی قوم برسرِ اقتدار آئے گی جس میں ہمت اور طاقت ہوگی، حاکمانہ اوصاف ہوں گے، عزائم اور حوصلے ہوں گے، صلابت اور عصبیت ہوگی۔ اگر تم میں یہ اوصاف ہوں تو وہ قوم تم ہو سکتے ہو۔ اور اگر تم ان سے عاری ہو تو بہرحال تمہاری قسمت میں محکومی کی ذلت اور ذلت کی موت ہی ہے۔ جو گھن کھائی ہوئی لاش کسی عصا کے سہارے پر کھڑی ہو وہ ہمیشہ کھڑی نہیں رہ سکتی۔ عصا کبھی نہ کبھی ہٹ کے رہے گا۔ اور لاش کبھی نہ کبھی گر کے رہے گی۔

تیسرے گروہ کی غلطی سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ دنیا ایک عرصۂ جنگ ہے جس میں تنازع للبقاء کا سلسلہ جاری ہے۔ اس معرکہ میں ان کے لیے کوئی کامیابی نہیں جو زندہ رہنے کے لیے مقابلہ اور مزاحمت کی

قوت نہ رکھتے ہوں۔ خصوصیت کے ساتھ ایک دور کے خاتمہ اور دوسرے دور کے آغاز کا وقت تو قوموں کی قسمتوں کے فیصلے کا وقت ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں سکون اور جمود کے معنی ہلاکت اور موت کے ہیں۔ اگر تم خود ہی مرجانا چاہتے ہو تو بیٹھے رہو اور اپنی موت کی آمد کا تماشہ دیکھے جاؤ۔ لیکن اگر زندہ رہنے کی خواہش ہے تو سمجھ لو کہ اس وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ یہ سستی رفتار کا زمانہ نہیں ہے۔ صدیوں کے تغیرات اب مہینوں اور برسوں میں ہو جاتے ہیں۔ جس انقلاب کے سامان اس وقت ہندوستان اور ساری دنیا میں ہو رہے ہیں وہ طوفان کی سی تیزی کے ساتھ آ رہا ہے۔ اب تمہارے لیے زیادہ سے زیادہ دس پندرہ برس کی مہلت ہے۔ اگر اس مہلت میں تم نے اپنی کمزوریوں کی تلافی نہ کی اور زندگی کی طاقت اپنے اندر پیدا نہ کی تو پھر کوئی دوسری مہلت تمہیں نہ ملے گی۔ اور تم وہی سب کچھ دیکھو گے جو دوسری کمزور قومیں اس سے پہلے دیکھ چکی ہیں۔ اللہ کا کسی قوم کے ساتھ رشتہ نہیں ہے کہ وہ اس کی خاطر اپنی سنت کو بدل ڈالے۔

جمود بہر حال ٹوٹنا چاہیے۔ حرکت کی ضرورت ہے اور شدید ضرورت ہے۔ مگر نری حرکت کسی کام کی نہیں۔ حکمت اور تدبر کے ساتھ حرکت ہونی چاہیے۔ خصوصاً نازک اوقات میں تو حرکت بلا تدبر کے معنی خود اپنے پاؤں چل کر خندق میں جا گرنے کے ہیں۔ یہ اندھے جوش اور ابلہانہ شتاب روی کا وقت نہیں۔ قدم اٹھانے سے پہلے ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لے کر سوچیے کہ قدم کس سمت میں اٹھانا چاہیے؟ آپ کی منزل مقصود کیا ہے؟ اس کی طرف جانے کا صحیح راستہ کونسا ہے؟ اس راستہ پر چلنے کے لیے آپ کو کس سامان کی ضرورت ہے؟ کن کن مرحلوں سے آپ کو گذرنا ہو گا؟ اور ہر مرحلے سے بسلامت گذر جانے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کرنی پڑیں گی؟

ہمارا سیاسی نصب العین

کسی راستہ پر چلنے سے پہلے منزلِ مقصود کا تعین ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ حرکت اور سفر کو بذاتِ خود تو مقصود نہیں بنایا جا سکتا۔ کم از کم ذی عقل و ہوش انسان کے لیے تو یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ محض چلنے کی خاطر چلیں اور منتہائے نظر کوئی نہ ہو۔ لہٰذا مسلمانوں کے تمام سوچنے والے لوگوں کو سب سے پہلے یہ طے کرنا چاہیے کہ ان کا منتہائے نظر یا نصب العین کیا ہے۔ اس کے بعد طریقِ کار اور راہِ عمل کا انتخاب زیادہ آسان ہو جائے گا، کیونکہ جب وہ مقام متعین ہو جس تک ہمیں جانا ہے تو وہ راستہ بڑی آسانی سے دریافت ہو سکتا ہے جو اس مقام تک پہنچنے کا سب سے زیادہ سیدھا اور سب سے زیادہ اقرب راستہ ہو۔

عام طور پر آزاد خیال مسلمان اپنی "قوم پرستی" کی نمائش کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ ہمارا نصب العین ہندوستان کی کامل آزادی ہے۔ لیکن یہ بات عموماً بغیر سوچے سمجھے کہہ دی جاتی ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہماری منزلِ مقصود محض آزادی ہی نہیں ہے بلکہ ایسی آزادی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان میں اسلام نہ صرف قائم رہے، بلکہ عزت اور طاقت والا بن جائے۔ آزادیٔ ہند ہمارے نزدیک مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ اصل مقصد کے لیے ایک ضروری اور ناگزیر وسیلہ ہونے کی حیثیت سے مقصود ہے۔ ہم صرف اس آزادی کے لیے لڑنا چاہتے ہیں، بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اپنے مذہب کی رو سے لڑنا فرض جانتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ ملک کلیۃً نہیں تو ایک بڑی حد تک دار الاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دار الکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بدتر ہو جائے تو ہم بلا کسی مداہنت کے صاف صاف کہتے ہیں کہ ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت ہے۔ اور اس کی راہ میں بولنا، لکھنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں

کھانا اور جیل جانا سب کچھ حرام قطعی حرام ہے۔

یہ ایسی صاف بات ہے جس میں دو رائیں ہونے کی گنجائش ہی نہیں، خصوصاً جو شخص قرآن اور سنت پر نظر رکھتا ہے اور منافق نہیں ہے وہ تو اس کے برحق ہونے میں چون وچرا نہیں کر سکتا۔

منزلِ مقصود کا انتہائی مقام یعنی ہندوستان کو کلیۃً دار الاسلام بنانا تو اتنا بلند مقام ہے کہ آج کل کا کم ہمت مسلمان اس کا قصد کرنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا۔ خیر جانے دیجیے اس کو۔ اس سے فروتر درجہ میں جس مقصد کے لیے ہمیں لڑنا ہے وہ کم سے کم یہ ہے کہ ہندوستان زیرِ تسلط ہندوستان میں آزادی کم سے کم مرتبہ بیرونی کفار تسلط میں ہے اور نہ اندرونی کفار کے کامل تسلط میں چلا جائے، بلکہ آزاد ہو کر شبہ دار الاسلام بن جائے۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے اس بات کو سمجھ لیجیے کہ شبہ دار الاسلام سے کیا مراد ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے معنی یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کے سے نام رکھنے والوں کو اسمبلیوں اور کونسلوں کی نشستیں اور سرکاری عہدے مل جائیں اور ہندوستان کے معاشی ثمرات میں ان کو بھی متناسب حصہ ملے، اور آزاد ہندوستان کی تمام عمرانی ترقیات سے (خواہ وہ ترقیات کسی صورت میں ہوں) انھیں بلا امتیاز مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے، تو ہم کہیں گے کہ وہ غلطی پر ہے۔ ہم جس چیز کو شبہ دار الاسلام سمجھتے ہیں، اور جو چیز درحقیقت اس نام سے موسوم ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت میں ہم محض "ہندوستانی" ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ "مسلمان" ہونے کی حیثیت سے حصہ دار ہوں، اور ہمارا حصہ اس قدر طاقتور ہو کہ

(۱) ہم اپنی قوم کی تنظیم اصول اسلامی کے مطابق کر سکیں، یعنی ہم کو حکومت کے ذریعہ سے اتنی قوت حاصل ہو کہ ہم مسلمانوں کے لیے اسلامی تعلیم و تربیت کا انتظام کر سکیں، ان کے اندر غیر اسلامی طریقوں کے رواج کو روک سکیں، ان پر اسلامی احکام جاری کر سکیں، اور اپنی قوم میں جو اصلاحات ہم خود اپنے طریق پر نافذ کرنے کی ضرورت سمجھیں ان کو خود اپنی طاقت سے نافذ کر سکیں، مثلاً زکوٰۃ کی تحصیل، اوقاف کی تنظیم، قضائے شرعی کا قیام، قوانین معاشرت کی اصلاح وغیرہ۔

(۲) ہم اس ملک کے نظم و نسق اور اس کی تمدنی و معاشی تعمیر جدید میں اپنا اثر اس طرح استعمال کر سکیں کہ وہ ہمارے اصول تمدن و تہذیب کے خلاف نہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ وسیع پیمانہ پر تمام ملک کی اجتماعی زندگی

اور معاشی تنظیم اور تدبیر مملکت کی مشین جو شکل بھی اختیار کرے گی اس کا اثر دوسری قوموں کی طرح ہماری قوم پر بھی پڑیگا۔ اگر یہ تعمیر جدید اس نقشہ پر ہو جو اپنے اصول و فروع میں کلیتہً ہماری تہذیب کی ضد ہے تو ہماری زندگی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے ناگزیر ہو جائے گا کہ یا تو ہم تمدن و معیشت کے اعتبار سے غیر مسلم بن جائیں یا پھر ہماری حیثیت اس ملک میں تمدنی و معاشی اچھوتوں کی سی ہو کر رہ جائے۔ اس نتیجہ کو صرف اسی طرح روکا جا سکتا ہے کہ ہندِ جدید کی تشکیل پر ہم اپنا اثر کافی قوت کے ساتھ ڈال سکیں۔

(۳) ہندوستان کی سیاسی پالیسی میں ہمارا اتنا اثر ہو کہ اس ملک کی طاقت کسی حال میں بیرونِ ہند کی مسلمان قوموں کے خلاف استعمال نہ کی جا سکے۔

کانگریس کے بنیادی حقوق ہمارے منتہائے نظر نہیں ہو سکتے

یہ مقصد جس کی ہم نے توضیح کی ہے وہ کم سے کم چیز ہے جس کے لیے ہم کو لڑنا چاہیے۔ مدافعت کا پہلو صرف کمزور اختیار کرتے ہیں اور ان کا آخری انجام شکست ہے۔

اگر آپ اپنا مقصد صرف ان حقوق کے حصول کو بناتے ہیں جن کا اطمینان کانگریس نے اپنے "بنیادی حقوق" والے ریزولیوشن میں دلایا ہے تو آپ دھوکے میں ہیں۔ آپ کی تہذیب، زبان، پرسنل لا، اور مذہبی حقوق کا تحفظ (جسے آپ کافی سمجھے بیٹھے ہیں) دراصل اس کے بغیر ممکن نہیں کہ آپ فارورڈ پالیسی اختیار کر کے حکومت کی تشکیل میں طاقتور حصہ دار بننے کی کوشش کریں۔ اس میں اگر آپ نے غفلت کی اور حکومت کا اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو مسلمان نہیں ہیں تو یقین رکھیے کہ کوئی کانسٹی ٹیوشن آپ کو من حیث المسلم ہلاک ہونے سے نہ بچا سکے گا۔ انگریزی حکومت نے بھی آپ کے بہت سے حقوق تسلیم کر رکھے ہیں۔ مگر غور کیجیے، وہ کیا چیز ہے جس نے آپ کو خود اپنے حقوق سے دست بردار کر دیا؟ انگریز نے آپ سے یہ کبھی نہیں کہا کہ اپنی زبان میں لکھنا پڑھنا، بولنا سب چھوڑ دو، زکوٰۃ نہ دو، شراب پیو، اور اپنے مذہب کے سارے احکام کو نہ صرف بالائے طاق رکھ دو، بلکہ ان کا مذاق تک اڑاؤ۔ پھر کس چیز نے آپ کی قوم کے لاکھوں کروڑوں افراد کو ایک صدی کے اندر اپنے دین و ایمان سے عملاً منحرف کر ڈالا؟ انگریز نے آپ سے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ اپنی معاشرت بدل دو، اپنا لباس بدل دو، اپنے مکانوں کے نقشے بدل دو، اپنے آداب و اخلاق بدل دو، اپنی صورتیں بگاڑ دو، اپنے بچوں کو انگریز بناؤ، اپنی عورتوں کو

میم صاحب بناؤ، اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کے سارے اصول چھوڑ کر پوری زندگی ہمارے نقشے پر ڈھال لو۔ پھر وہ کونسی چیز ہے جس نے آپ سے یہ سب کچھ کرا ڈالا؟ ذرا دماغ پر زور ڈال کر سوچئے کیا اس کا سبب غیر مسلم اقتدار کے سوا اور بھی کچھ ہے؟ ڈھائی تین لاکھ انگریز چھ ہزار میل دور سے آتے ہیں۔ آپ سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ قصداً آپ کے اندرونی معاملات اور آپ کے تمدنی و معاشرتی مسائل میں دخل دینے سے پرہیز کرتے ہیں۔ پھر بھی ان کے اقتدار کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بیرونی جبر سے نہیں، بلکہ اندرونی انقلاب سے آپ کی کایا پلٹ جاتی ہے اور آپ خود بخود اپنے ان بنیادی اور فطری حقوق تک سے دست بردار ہو جاتے ہیں جن کو کوئی حکومت اپنی رعایا سے نہیں چھینتی اور نہیں چھین سکتی۔ اب ذرا اندازہ لگائیے کہ اگر آزاد ہندوستان کی حکومت غیر اسلامی نقشہ پر بن گئی اور اس کا اقتدار ان ہندوستانیوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو مسلمان نہیں ہیں تو اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ وہ انگریزوں کی طرح قلیل التعداد بھی نہیں۔ آپ سے الگ تھلگ رہنے والے بھی نہیں اور پھر غیر ملکی بھی نہیں ہیں کہ سیاسی پالیسی ان کو تمدنی و معاشرتی مسائل میں دخل دینے سے روکے۔ ان کے اقتدار میں آپ کے اندرونی تحول اور انقلاب کا کیا حال ہوگا اور کانسٹی ٹیوشن کی کون کون سی ضمانات آپ کو اپنے حقوق کی پامالی سے روک سکیں گی؟

مسلمانوں کے لئے صرف ایک راستہ ہے

پس جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مسلمانوں کے لئے ایسی آزادیٔ وطن کی خاطر لڑنا تو قطعی حرام ہے جس کا نتیجہ انگلستانی غیر مسلموں سے ہندوستانی غیر مسلموں کی طرف اقتدار حکومت کا انتقال ہو۔ پھر ان کے لئے یہ بھی حرام ہے کہ وہ اس انتقال کے عمل کو بیٹھے ہوئے خاموشی سے دیکھتے رہیں۔ اور ان کے لئے یہ بھی حرام ہے، کہ اس انتقال کو روکنے کی خاطر انگلستانی غیر مسلموں کا اقتدار قائم رکھنے میں معاون بن جائیں۔ اسلام ہم کو ان تینوں راستوں پر جانے سے روکتا ہے۔ اب اگر ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور ہندوستان میں اسلام کا وہ حشر دیکھنے کے لئے تیار نہیں جو اسپین اور سسلی میں ہو چکا ہے، تو ہمارے لئے صرف ایک ہی راستہ باقی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم آزادیٔ ہند کی تحریک کا رُخ حکومت کفر کی طرف سے حکومتِ حق کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں اور اس غرض کے لئے ایک ایسی سرفروشانہ جنگ پر کمر بستہ ہو جائیں جس کا انجام یا کامیابی ہو یا موت۔

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

ہم آزادیٔ ہند کے مخالف نہیں بلکہ ہر آزادی خواہ سے بڑھ کر اس کے خواہشمند ہیں۔ اور اس کے لئے جنگ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ لیکن وطن پرست کے نصب العین سے ہمارا نصب العین مختلف ہے۔ وہ صرف ایسی آزادی چاہتا ہے جس کا نتیجہ "ہندوستانی" کی نجات ہو۔ اور ہم وہ آزادی چاہتے ہیں جس کا نتیجہ ہندوستانی کے ساتھ "مسلم قوم" کی نجات بھی ہو۔

راہِ عمل

اب ہم کو اس سوال پر غور کرنا ہے کہ ہندوستان میں اسلامی قومیت کا وہ نصب العین جس کو ہم نے اشاعتِ گزشتہ میں بیان کیا تھا کس طریقہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس نصب العین سے کسی مسلم فرد یا گروہ کو اختلاف نہیں۔ اختلاف جو کچھ بھی ہے۔ اس امر میں ہے۔ کہ ہمارے لئے صحیح راستہ کون سا ہے؟ اب ہمیں ان مختلف راستوں پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالنی چاہیے۔ جو ہمارے سامنے ہیں۔ اس کے بعد راہِ راست خود بخود واضح ہو جائے گی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی دو حیثیتیں

ہندوستان میں ہماری دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت ہمارے "ہندوستانی" ہونے کی ہے، اور دوسری حیثیت مسلمان ہونے کی۔

پہلی حیثیت میں ہم اس ملک کی تمام دوسری قوموں کے شریکِ حال ہیں۔ ملک افلاس اور فاقہ کشی میں مبتلا ہو گا تو ہم بھی مفلس اور فاقہ کش ہوں گے۔ ملک کو لوٹا جائے گا تو ہم بھی سب کے ساتھ لوٹے جائیں گے۔ ملک میں جور و ظلم کی حکومت ہو گی تو ہم بھی اسی طرح پامال ہوں گے جس طرح ہمارے اہلِ وطن ہوں گے۔ ملک پر غلامی کی وجہ سے بحیثیت مجموعی جتنی مصیبتیں نازل ہوں گی جتنی لعنتیں برسیں گی، ان سب میں ہم کو برابر کا حصہ ملے گا۔ اس لحاظ سے ملک کے جتنے سیاسی اور معاشی مسائل ہیں وہ سب کے سب ہمارے اور دوسری اقوامِ ہند کے درمیان مشترک ہیں جس طرح ان کی فلاح و بہبود ہندوستان کی آزادی کے ساتھ وابستہ ہے، اسی طرح ہماری بھی ہے۔ سب کے ساتھ ہماری بہتری بھی اس پر منحصر ہے کہ یہ ملک ظالموں کے تسلط سے آزاد ہو، اس کے وسائلِ ثروت اسی کے باشندوں کی بہتری اور ترقی پر صرف ہوں۔ اس کے بسنے والوں کو اپنے افلاس، اپنی جہالت، اپنی اخلاقی پستی اور اپنی تمدنی پسماندگی کا علاج کرنے میں

اپنی قوتوں سے کام لینے کے پورے مواقع حاصل ہوں، اور کوئی جابر قوم ان کو اپنی ناجائز اغراض کے لئے آلۂ کار بنانے پر قادر نہ رہے۔

دوسری حیثیت میں ہمارے مسائل کچھ اور ہیں جن کا تعلق صرف ہم ہی سے ہے۔ کوئی دوسری قوم ان میں ہماری شریک نہیں ہے۔ اجنبی استیلاء نے ہمارے قومی اخلاق کو، ہماری قومی تہذیب کو، ہمارے اصولِ حیات کو، ہمارے نظامِ جماعت کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ ڈیڑھ سو برس کے اندر غلامی ان تمام بنیادوں کو گھن کی طرح کھا گئی ہے جن پر ہماری قومیت قائم ہے۔ تجربے نے ہم کو بتا دیا ہے اور روزِ روشن کی طرح اب ہم اس حقیقت کو دیکھ رہے ہیں کہ اگر یہ صورتِ حال زیادہ مدت تک جاری رہی تو ہندوستان کی اسلامی قومیت رفتہ رفتہ گھل گھل کر طبعی موت مر جائے گی، اور یہ برائے نام ڈھانچہ جو باقی رہ گیا ہے یہ بھی باقی نہ رہے گا۔ اس حکومت کے اثرات ہم کو اندر ہی اندر غیر مسلم بنائے جا رہے ہیں۔ جن سے اسلامیت کا درخت پیدا ہوتا ہے۔ ہم کو وہ حشیش پلایا جا رہا ہے۔ جو ہماری اہمیت کو بدل کر خود ہمارے ہی ہاتھوں سے ہماری مسجد کو منہدم کرا دے۔ جس رفتار کے ساتھ ہم میں یہ تغیرات ہو رہے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے ایک مبصر اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس عمل کی تکمیل اب بہت قریب آ گئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ تیسری چوتھی پشت تک پہنچتے پہنچتے ہمارا سوادِ اعظم خود بخود غیر مسلم بن جائے گا، اور شاید گنتی کے چند نفوس اس عظیم الشان قوم کے مقبرے پر آنسو بہانے کے لئے رہ جائیں گے۔ پس ہماری قومیت کا بقا و تحفظ اس پر منحصر ہے کہ ہم اس حکومت کے تسلط سے آزاد ہوں اور اس نظامِ اجتماعی کو از سرِ نو قائم کریں جس کے مٹ جانے ہی کی بدولت ہم پر یہ مصائب نازل ہوئے ہیں۔

آزادیٔ وطن کے دو راستے

ہماری یہ دونوں حیثیتیں باہم متلازم ہیں۔ ان کو نہ عقلاً منفک کیا جا سکتا ہے نہ عملاً۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ آزادی ان دونوں حیثیتوں سے ہماری مقصود ہے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے جتنے مسائل ہمارے اور تمام دوسرے باشندگانِ ہند کے درمیان مشترک ہیں ان کو حل کرنے کے لئے مشترک طور پر ہی جدوجہد کرنی چاہئے، اور یہ بھی سراسر درست ہے کہ مسلم ہونے کی حیثیت سے جو آزادی ہم چاہتے ہیں وہ بھی بہر طور ہمیں اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ ہمیں

ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے آزادی حاصل ہو جائے، لیکن یہ تماثل اور توافق جو بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے اس میں ایک بڑا دھوکا چھپا ہوا ہے۔ اور درحقیقت اسی مقام پر بہت سوں نے دھوکا کھایا ہے۔

غائر نگاہ سے آپ دیکھیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کوئی سیدھی سڑک نہیں ہے جس پر آپ آنکھیں بند کر کے بے تکان چلے جائیں۔ ٹھیک اسی مقام پر جہاں آپ آکر ٹھیرے ہیں ایک دوراہہ موجود ہے۔ دو سڑکیں بالکل مختلف سمتوں میں جا رہی ہیں اور آپ کو قدم اٹھانے سے پہلے عقل و تمیز سے کام لے کر فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے کہ جانا کدھر ہے؟

وطن پرستی کا راستہ ہم اختیار نہیں کرسکتے

آزادیٔ وطن کا ایک راستہ وہ ہے جس کو ہم صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے اختیار کر سکتے ہیں۔ اس راہ کے بنانے والے اور اس پر ہندوستانیوں کو چلانے والے وہ لوگ ہیں جن کے پیش نظر وطنی قومیت کا مغربی تصور ہے، اور اس تصور کی تہ میں انسانیت کا ہندو تصور گہرا جما ہوا ہے۔ ان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مختلف قومی امتیازات جو مذہب اور تہذیب کی تفریق پر قائم ہیں مٹ جائیں اور سارا ملک ایک قوم بن جائے۔ پھر اس "قوم" کی زندگی کا جو نقشہ ان کے سامنے ہے۔ وہ اشتراکیت اور ہندویت سے مرکب ہے، اور اس میں مسلمانوں کے اصول حیات کی رعایت تو درکنار، اس کے لئے کوئی ہمدردانہ نقطۂ نظر بھی ان کے پاس نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جس کی گنجائش وہ اس "ہندی قومیت" میں نکال سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ جن معاملات کا تعلق انسان اور خدا کے مابین ہے ان میں ہر گروہ کو اعتقاد اور عمل کی آزادی حاصل رہے۔ مگر جو معاملات انسان اور انسان کے درمیان ہیں ان کو وہ خالص وطنیت کی بنیاد پر دیکھنا چاہتے ہیں منظم مذہب (Organised religion) یعنی ایسا مذہب ان کے نزدیک اصولاً قابل اعتراض ہے جو اپنے متبعین کو ایک مستقل قوم بناتا ہو اور اس کو تعلیم، معیشت، معاشرت، تمدن، اخلاق اور تہذیب میں دوسرے مذاہب کے متبعین سے الگ ایک ڈھنگ اختیار کرنے اور ایک ضابطہ کی پابندی کرنے پر مجبور کرتا ہو۔ وہ ہندوستان کے موجودہ حالات کی رعایت ملحوظ رکھ کر کچھ مدت تک اس قسم کے "منظم مذہب" کو ایک محدود اور دھندلی شکل میں باقی رکھنا گوارا کرلیں گے، چنانچہ اسی گوارا کرلینے کے انداز میں انھوں نے ہندوستان کے مختلف فرقوں کو ان کی زبان اور پرسنل لا کے تحفظ کا یقین دلایا ہے۔ مگر وہ کسی ایسے

نظام کو برداشت نہیں کر سکتے جو اس منظم مذہب کو مزید طاقت اور مستقل زندگی عطا کرنے والا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس وہ ہندوستانِ جدید کی تعمیر اس طرز پر کرنا چاہتے ہیں جس میں یہ "منظم مذہب" رفتہ رفتہ مضمحل ہو کر طبعی موت مر جائے اور ہندوستان کی ساری آبادی ایک ایسی قوم بن جائے جس میں سیاسی پارٹیوں اور معاشی گروہوں کی تفریق تو چاہے کتنی ہی ہو، مگر تعلیم و تہذیب، تمدن و معاشرت، اخلاق و آداب اور تمام دوسری حیثیات سے سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہوں، اور وہ رنگ فطرۃً وہی ہونا چاہئے، جو اس تحریک کے محرکوں کا رنگ ہے۔

یہ راستہ جس کی خصوصیات کو آج ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے، ہم صرف اسی وقت اختیار کر سکتے ہیں جب کہ ہم اپنی دوسری حیثیت کو قربان کرنے پر راضی ہو جائیں۔ اس راستہ پر چل کر ہم کو وہ آزادی حاصل نہیں ہو سکتی جو ہمیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے درکار ہے، بلکہ اس راستے میں سرے سے ہماری یہ حیثیت ہی گم ہو جاتی ہے۔ اس کو اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انگریزی حکومت کے ماتحت جس انقلاب کا عمل ڈیڑھ سو برس سے ہماری قوم میں ہو رہا ہے وہ ہندوستانی حکومت کے ماتحت اور زیادہ شدت و سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچے اور اس کی تکمیل میں ہم خود مددگار بنیں۔ اور وہ اتنا مکمل انقلاب ہو کہ پھر اس کے ردِ عمل کا کوئی امکان نہ رہے۔ انگریزی حکومت کے اثر سے مغربی تہذیب میں خواہ ہم کتنے ہی جذب ہو جائیں، بہر حال انگریزی قومیت میں جذب نہیں ہو سکتے بہر حال ہمارا ایک الگ اجتماعی وجود باقی رہتا ہے جس کا پھر اپنی سابقہ صورت پر واپس ہونا ممکن ہے۔ لیکن یہاں تو صورتِ حال ہی دوسری ہے، ایک طرف ہمارے ہر امتیازی نشان حتیٰ کہ ہمارے احساسِ قومیت تک کو فرقہ پرستی (Communalism) قرار دے کر اس کے خلاف نفرت انگیز پراپیگنڈا کیا جاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ایک مستقل جماعت (Communit) کی حیثیت سے ہمارا وجود ناقابلِ برداشت ہے۔ دوسری طرف ہماری قوم کے ان لوگوں کو قوم پرست (Nationalists) کہا جاتا ہے جو ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے ہیں، "بندے ماترم" کے نعرے لگاتے ہیں، مندروں میں پہنچ کر عبادت تک میں حصہ لے گزرتے ہیں، اپنی صورتوں اور لباسوں میں پورا ہندویت کا رنگ اختیار کرتے ہیں، اور مسلمان قوم کے مفاد کا نام تک لیتے ہوئے انہیں ڈر لگتا ہے کہ مبادا ان پر فرقہ پرستی (Communalism) کا الزام نہ آجائے، جوان کے

نزدیک کفر کے الزام سے زیادہ بد تر ہے۔ تیسری طرف ہم سے صاف کہا جاتا ہے کہ ایک جماعت بن کر نہ آؤ بلکہ افراد بن کر آؤ، اور سیاسی پارٹیوں میں، مزدور اور سرمایہ دار کی تفریق میں، زمیندار اور کسان کی تقسیم میں، زر والے اور بے زر کے تنازع میں منقسم ہو جاؤ۔ بالفاظ دیگر اس رشتے کو خود ہی کاٹ دو جو مسلم اور مسلم میں ہوتا ہے اور اس رشتہ میں بندھ جاؤ جو ایک پارٹی کے مسلم اور غیر مسلم ممبروں میں ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہے اسے سمجھنے کے لئے کچھ زیادہ عقل و فکر کی ضرورت نہیں۔ اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ تحریکِ آزادیِ وطن کے دوران ہی میں ہمارا اجتماعی وجود فنا بھی ہو جائے، اور ہم جدا جدا قطروں کی شکل اختیار کر کے جدید نیشنلزم کی خاک میں جذب بھی ہو جائیں۔ پھر بحیثیت مسلمان قوم کے ہم نشاۃ ثانیہ کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔

جو لوگ صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے آزادی چاہتے ہیں، اور جن کی نگاہ میں آزادی کے منافع اس قدر قیمتی ہیں کہ اپنی اسلامی حیثیت کو وہ بخوشی ان پر قربان کر سکتے ہیں، وہ اس راستہ پر ضرور جائیں مگر ہم یہ تسلیم کرنے سے قطعی انکار کرتے ہیں کہ کوئی سچا مسلمان ایسی تحریکِ آزادیِ وطن میں جان بوجھ کر حصہ لینا گوارا کریگا۔

ہم کیسی آزادی چاہتے ہیں

آزادیِ وطن کے لئے دوسرا راستہ صرف وہی ہو سکتا ہے جس میں کسی باشندۂ ہند کے ہندوستانی ہونے کی حیثیت اور اس کے مسلم یا ہندو یا عیسائی یا سکھ ہونے کی حیثیت میں کوئی تناقض نہ ہو جس میں ہر گروہ کو دونوں حیثیتوں سے آزادی حاصل ہو جس کی نوعیت یہ ہو کہ مشترک وطنی مسائل کی حد تک تو امتیازِ مذہب و ملت کا شائبہ تک نہ آنے پائے، مگر جداگانہ قومی مسائل میں کوئی قوم دوسری قوم سے تعرض نہ کر سکے، اور ہر قوم کو آزاد ہندوستان کی حکومت میں اتنی طاقت حاصل ہو کہ وہ اپنے ان مسائل کو خود حل کرنے کے قابل ہو۔

جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں، ہندوستان کی آزادی کے لئے جنگ کرنا ہمارے لئے قطعاً ناگزیر ہے لیکن ہم جس قسم کی آزادی کے لئے لڑ سکتے ہیں۔ اور لڑنا فرض جانتے ہیں، وہ یہی ہے۔ رہی وہ آزادی جو "وطن پرستوں" کے پیشِ نظر ہے، تو اس کی حمایت میں لڑنا کیا معنی، ہم تو اسے انگریزوں کی غلامی سے بھی زیادہ ملعون سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کے علمبردار مسلمانوں کے لئے وہی کچھ ہیں جو کلایو اور ولزلی تھے، اور ان کے پیرو مسلمان کسی حیثیت سے بھی میر جعفر اور میر صادق سے مختلف نہیں ہیں۔ گو صورتیں اور حالات مختلف ہیں

گر دشمنی اور غداری کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں۔[1]

کانگریس کی طرف بلانے والوں کی غلطی

اب سوال یہ ہے کہ یہ آزادی جس کو ہم اپنا مقصود بتارہے ہیں کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ مسلمانوں میں آج کل دو گروہ نمایاں ہیں جو دو مختلف تجویزیں پیش کر رہے ہیں۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ آزادیِ وطن کے لئے جو جماعت جدوجہد کر رہی ہے اس کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرو اور جب وہ انھیں منظور کر لے تو اس کے ساتھ شریک ہو جاؤ۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بلا کسی شرط کے اس آزادی کی تحریک میں حصہ لو۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں گروہ غلطی پر ہیں۔ پہلے گروہ کی غلطی یہ ہے کہ وہ کمزوروں کی طرح بھیک مانگنا چاہتا ہے۔ بالفرض اگر اس نے مطالبہ کیا اور انھوں نے مان بھی لیا تو نتیجہ کیا نکلے گا؟ جس قوم میں خود زندہ رہنے اور اپنی زندگی اپنے بل بوتے پر قائم رکھنے کی صلاحیت نہیں۔ اس کو دوسرے کب تک زندہ رکھ سکیں گے؟ رہا دوسرا گروہ تو وہ آزادی کے جوش میں اپنی قوم کی ان بنیادی کمزوریوں کو بھول جاتا ہے جنھیں گذشتہ صفحات میں ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ اگر ثابت کر دیا جائے کہ وہ کمزوریاں واقعی نہیں ہیں، اور مسلمان درحقیقت اس قدر طاقت ور ہیں کہ جدید نیشنلزم سے ان کی قومیت اور قومی تہذیب کو کسی قسم کا خطرہ نہیں، تو ہم اپنی رائے واپس لینے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن اگر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا، اور ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ نہیں کیا جا سکتا، تو پھر صاف سن لیجئے کہ اس مرحلہ پر مسلمانوں کو کانگریس کی طرف دعوت دینا دراصل ان کو خودکشی کا مشورہ دینا ہے۔ محض جذبات سے اپیل کر کے آپ حقائق کو نہیں بدل سکتے۔ جس مریض کی آدھی جان نکل چکی ہے اس کے سامنے سپہ سالار بن کر آنے سے پہلے آپ کو حکیم بن کر آنا چاہئے۔ پہلے اس کی

---

[1] بعض حضرات نے اس فقرے کی سختی کی شکایت کی ہے۔ ان کے اطمینانِ قلب کے لئے یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ اس فقرے میں میرا روئے سخن ان لوگوں کی جانب نہیں ہے جو سچے مسلمان ہیں اور محض اجتہادی غلطی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ بلکہ میں دو قسم کے لوگوں کو میر جعفر و میر صادق سے تشبیہ دے رہا ہوں۔ ایک وہ جن کے دلوں سے درحقیقت اسلام نکل چکا ہے مگر وہ مسلمانوں کے بھیس میں رہ کر ملتِ مسلمہ کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ دوسرے وہ جنھوں نے اپنی اغراض کو اپنا معبود بنا لیا ہے اور ہر بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے سجدہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

نبض دیکھیے اور اس کے مرض کا علاج کیجئے، پھر اس کی کمر سے تلوار بھی باندھ لیجئے گا۔ یہ کہاں کی ہوشمندی ہے، کہ مریض تو بستر پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ اور آپ اس کے سرہانے کھڑے خطبہ دے رہے ہیں کہ اٹھ بہادر، اپنی طاقت کے بل پر کھڑا ہو، باندھ کمر سے تلوار اور چل میدانِ کارزار میں!

یہ دونوں راستے جنھوں نے اختیار کئے ہیں۔ ان میں متعدد حضرات ایسے ہیں جن کے لئے ہمارے دل میں غایت درجہ کا احترام موجود ہے۔ ان کے خلوص ایمان میں ہم کو ذرہ برابر شک نہیں۔ مگر ان کی جلالتِ شان کا پورا پورا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ وہ اس وقت مسلمانوں کی غلط رہنمائی کر رہے ہیں، اور اس غلط رہنمائی کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن اور مستقبل کے امکانات پر کافی غور و خوض نہیں کیا ہے۔

چند غور طلب حقائق ہمارے رہنماؤں کو قدم اٹھانے سے پہلے حسب ذیل حقائق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے:-

(۱) مسلمانوں کی حیاتِ قومی کو برقرار رکھنے کے لئے وہ چیز بالکل ناگزیر ہے جس کو آج کل سیاسی اصطلاح میں "سلطنت کے اندر ایک سلطنت" (State within state) کہا جاتا ہے۔ ان کی سوسائٹی جن بنیادوں پر قائم ہے وہ استوار ہی نہیں رہ سکتیں جب تک کہ خود ان کی اپنی جماعت میں کوئی قوتِ ضابطہ اور ہیئتِ حاکمہ موجود نہ ہو۔ ایسی ایک مرکزی طاقت کے بغیر کسی غیر مسلم نظامِ حکومت میں رہنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کا اجتماعی نظام رفتہ رفتہ مضمحل ہو کر فنا ہو جائے اور وہ بحیثیت ایک مسلم قوم کے زندہ ہی نہ رہ سکیں۔

(۲) اٹھارویں صدی کے سیاسی انقلاب نے ہم کو اس چیز سے محروم کر دیا۔ اور اس کی بدولت جو اضمحلال ہماری سوسائٹی میں رونما ہوا اسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ڈیڑھ سو برس تک مسلسل اور پیہم انحطاط کی طرف لے جانے کے بعد یہ انقلاب ہم کو ایک ایسے مقام پر چھوڑ رہا ہے جہاں ہماری جمعیت پراگندہ، ہمارے اخلاق تباہ، ہماری سوشل لائف ہر قسم کی بیماریوں سے زار و نزار اور ہمارے دین و اعتقاد تک کی بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں اور ہم موت کے کنارے پر کھڑے ہوئے ہیں۔

(۳) اب ایک دوسرے انقلاب کی ابتدا ہو رہی ہے جس میں دو قسم کے امکانات ہیں۔ اگر ہم نے ہی غفلت سے کام لیا جس سے گذشتہ انقلاب کے موقع پر کام لیا تھا، تو یہ دوسرا انقلاب بھی اسی سمت میں جائے گا

جس میں پہلا انقلاب گیا تھا، اور یہ اس نتیجہ کی تکمیل کر دے گا جس کی طرف ہمیں اس کا بیش رو لے جارہا تھا اور اگر ہم غیر مسلم نظامِ حکومت کے اندر ایک مسلم نظامِ حکومت (خواہ وہ محدود پیمانہ ہی پر ہو) قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو انقلاب اپنا رُخ بدل دے گا اور ہمیں اپنے نظمِ اجتماعی کو پھر سے مضبوط کر لینے کا ایک موقع ہاتھ آجائے گا۔

(۴) سلطنت کے اندر ایک سلطنت قائم کرنا کسی سمجھوتے اور کسی میثاق کے ذریعہ سے ممکن نہیں کوئی غیر مسلم سیاسی جماعت، خواہ وہ کیسی ہی فیاض اور وسیع المشرب ہو، اس کے لئے بخوشی آمادہ نہیں ہو سکتی۔ نہ اس کو بحث و مباحثہ کی طاقت سے کسی دستوری قانون میں داخل کرایا جا سکتا ہے۔ اور بالفرض اگر یہ ہو بھی جائے تو ایسی غیر معمولی چیز جس کی پشت پر کوئی طاقت ور رائے عام اور منظم قوت موجود نہ ہو عملی سیاست میں نقش بر آب سے زیادہ پائیدار نہیں ہوتی۔ درحقیقت یہ چیز اگر کسی ذریعہ سے پائیدار بنیادوں پر قائم ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ہم خود اپنے نظام کی قوت اور اپنے ناقابلِ تسخیر متحدہ ارادے سے اس کو بالفعل قائم کر دیں اور یہ ایک ایسا حاصل شدہ واقعہ (Accomplished fact) بن کر ہندوستان کے آیندہ نظامِ حکومت کا جز بن جائے جس کو کوئی طاقت واقعہ سے غیر واقعہ نہ بنا سکے۔

(۵) یہ کام اس طرح انجام نہیں پا سکتا کہ ہم سرِ دست انقلاب کو اسی رفتار پر جانے دیں اور اس کی تکمیل ہو جانے کے بعد جب ہندوستان میں مکمل طور پر ایک غیر مسلم نظامِ حکومت قائم ہو جائے، اس وقت سلطنت کے اندر ایک سلطنت بنانے کی کوشش کریں۔ اس چیز کو صرف وہی شخص قابلِ عمل خیال کر سکتا ہے جس کو عملی سیاست کی ہوا تک چھو کر نہ گذری ہو۔ ایک ہوشمند آدمی تو بادنیٰ تامل یہ سمجھ لے گا کہ انقلاب کا رُخ صرف دورانِ انقلاب ہی میں بدلا جا سکتا ہے۔ اور سلطنت کے اندر سلطنت صرف اسی صورت میں بن سکتی ہے جب کہ سلطنت کی تعمیر کے دوران میں اس کی بنا ڈال دی جائے۔

(۶) جس قسم کی تنظیم اس مقصد کے لئے درکار ہے وہ کانگریس کے فریم میں داخل ہو کر نہیں کی جا سکتی۔ کانگریس ایک منظم جماعت ہے۔ اور ہر منظم جماعت میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ افراد کو اپنے دائرے میں لے کر اپنی فطرت اور اپنے مخصوص نفسیات کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ مسلمانوں میں اگر مضبوط اسلامی کیرکٹر اور طاقتور اجتماعی نظم موجود ہو تو البتہ وہ کانگریس کے فریم میں داخل ہو کر اس کے نفسیات اور حصولِ مقاصد

میں تغیر پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت وہ جن کمزوریوں میں مبتلا ہیں۔ جن کی تشریح پہلے کی جاچکی ہے، ان کو لئے ہوئے منتشر افراد کی صورت میں ان کا ادھر جانا تو صرف ایک ہی نتیجہ پیدا کر سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے جمہور پر کانگرسی نفسیات کا غلبہ ہو جائے۔ وہ اکابر کانگرس کی رہنمائی تسلیم کر کے ان کے اشارات پر چلنے لگیں اور اسلامی مقاصد کے لئے مسلمانوں میں ایک رائے عام تیار کرنے کے جو امکانات ابھی باقی ہیں، وہ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں۔ ہر شخص جس کو خدا نے دیدۂ بینا عطا کیا ہے، اس بات کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ "نیشنلسٹ" قسم کے مسلمان اگر کانگرس کے اندر کوئی بڑی قوت پیدا کر لیں اور حکومت کے اقتدار میں بھی کوئی بڑا حصہ مل جائے تب بھی وہ مسلمانوں کے لئے کچھ مفید نہ ہوں گے، بلکہ غیر مسلموں سے کچھ زیادہ ہی نقصان رساں ثابت ہوں گے۔ اس لئے کہ وہ ہر معاملہ میں پالیسی اور طریق کار تو وہی اختیار کریں گے جو ایک غیر مسلم کرے گا، مگر ایسا کرنے کے لئے ان کو اس سے زیادہ آزادی اور جرأت حاصل ہوگی جو ایک غیر مسلم کو حاصل ہو سکتی ہے اس لئے کہ بدقسمتی سے ان کے نام مسلمانوں کے سے ہوں گے۔

اسلامی جماعت کو مضبوط بنانے کے لئے ضروری تدابیر مذکورہ بالا حقائق کو پیش نظر رکھ کر جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے لئے اب صرف ایک ہی راستہ باقی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان کی آزادی کے لئے جنگ میں شریک ہونے سے پہلے اپنی کمزوریوں کو دور کریں۔ اور اپنے اندر وہ طاقت پیدا کریں جس سے ہندوستان کی آزادی کے ساتھ مسلمان کی آزادی کا حصول بھی ممکن ہو ——— اس غرض کے لئے ہم کو اپنی قوتیں جن کاموں پر صرف کرنی چاہییں وہ حسب ذیل ہیں:-

۱- مسلمانوں میں وسیع پیمانہ پر اصول اسلام اور قوانین شریعت کا علم پھیلایا جائے۔ اور ان کے اندر کم از کم اتنی واقفیت پیدا کر دی جائے کہ وہ اسلام کے حدود کو پہچان لیں اور یہ سمجھ سکیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کن خیالات اور کن عملی طریقوں کو قبول کر سکتے ہیں اور کن کو قبول نہیں کر سکتے۔ یہ نشر و تبلیغ صرف شہروں ہی میں نہیں ہونی چاہئے، بلکہ دیہات کے مسلمانوں کو شہری مسلمانوں سے زیادہ اس کی ضرورت ہے۔

۲- علم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو عملاً احکام اسلامی کا متبع بنانے کی کوشش کی جائے۔ اور خصوصیت کے ساتھ ان ارکان کو پھر سے استوار کیا جائے جن پر ہمارے نظام جماعت کی بنیاد قائم ہے۔

۳۔ مسلمانوں کی رائے عام کو اس طرح تربیت کیا جائے کہ وہ غیر اسلامی طریقوں کے رواج کو روکنے پر مستعد ہوجائیں، اور ان کا اجتماعی ضمیر (Social Common-sense) احکامِ اسلامی کے خلاف افراد کی بغاوت کو برداشت کرنا چھوڑ دے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جس چیز کے استیصال پر توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے وہ تشبہ بالاجانب ہے، کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو ہم کو غیروں میں جذب ہونے کے لئے تیار کرتی ہے۔

۴۔ ہمیں اپنی اجتماعی قوت اتنی مضبوط کرنی چاہیے کہ اپنی جماعت کے ان غداروں اور منافقوں کا استیصال کرسکیں جو اپنے دل کے چھپے ہوئے کفر و نفاق کی وجہ سے یا ذاتی اغراض کی خاطر اسلامی مفاد کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

۵۔ ہمیں اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ جمہور مسلمین کی قیادت کا منصب نہ انگریز کے غلاموں کو حاصل ہوسکے، نہ ہندو کے غلاموں کو۔ بلکہ ایک ایسی جماعت کے قبضہ میں آجائے جو ہندوستان کی کامل آزادی کے لئے دوسری ہمسایہ قوموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے پر دل سے آمادہ ہو، مگر اسلامی مفاد کو کسی حال میں قربان کرنے پر آمادہ نہ ہو۔

۶۔ مسلمانوں میں اس قدر اتحادِ خیال اور اتحادِ عمل پیدا کردیا جائے کہ وہ تنِ واحد کی طرح ہوجائیں اور ایک مرکزی طاقت کے اشاروں پر حرکت کرنے لگیں۔

اس وقت مسلمانوں کی جو حالت ہے اس کو دیکھتے ہوئے شاید بعض لوگ یہ خیال کریں گے کہ ایسا ہونا محال ہے۔ خود میرے متعدد دوستوں نے کہا کہ تم خیالی پلاؤ پکا رہے ہو۔ یہ قوم اس قدر گر چکی ہے کہ اب کوئی اعجازی قوت ہی اس کو سنبھالے تو سنبھالے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ابھی اس قوم کو سنبھالنے کا موقع آخری موقع باقی ہے۔ ہمارے خواص خواہ کتنے ہی بگڑ چکے ہوں، مگر ہمارے عوام میں ابھی ایمان کی دبی ہوئی ایک چنگاری موجود ہے اور وہی ہمارے لئے آخری شعاعِ امید ہے۔ قبل اس کے کہ وہ بجھے ہم اس سے بہت کچھ کام لے سکتے ہیں، بشرطیکہ چند مردِ مومن ایسے اٹھ کھڑے ہوں جو خلوصِ نیت کے ساتھ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے ہوں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ ہم کانگریس سے تصادم چاہتے ہیں۔ ہرگز نہیں، ہندوستانی

ہونے کی حیثیت سے تو ہمارا مقصد وہی ہے جو کانگریس کا ہے۔ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس مشترک مقصد کے لئے ہم کو بالآخر کانگریس کے ہی ساتھ تعاون کرنا ہے۔ لیکن سر دست ہم اس سے صرف اس لئے علیحدہ رہنا چاہتے ہیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنے مفاد کا تحفظ کرنے کے لئے ہم کو جس اخلاقی قوت اور جتماعی نظم کی ضرورت ہے وہ ہم میں نہیں ہے۔ سب سے پہلے ہم اپنی ان کمزوریوں کو دور کرنا چاہتے ہیں اور اس غرض کے لئے ہم کو ایسی فضا درکار ہے جو مزاحمت اور تصادم سے پاک ہو۔ پس اگر کانگریس ہم سے تعرض کئے بغیر اپنا کام جاری رکھے تو ہمیں اس سے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اس کے برعکس ہماری ہمدردیاں مشترک ہندوستانی مقاصد کی حد تک اس کے ساتھ رہیں گی۔ البتہ اگر وہ ہماری غیر منظم جماعت کو اپنے نظم میں جذب کرنے کی کوشش کرے گی، اور براہِ راست ہمارے عوام میں "وطن پرستی" اور "اشتراکیت" کی تبلیغ شروع کر دے گی۔ اور اس غرض کے لئے ہماری قوم کے ان منافقوں سے کام لے گی جن کی حیثیت ہماری نگاہ میں دوسری قسم کے منافقوں (یعنی انگریزی اقتدار کے ایجنٹوں) سے کچھ بھی مختلف نہیں تو اس صورت میں ہم کو مجبوراً اس سے لڑنا پڑے گا۔ اور اس لڑائی کا تمام تر الزام خود اسی پر عائد ہو گا۔

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی موجودہ پالیسی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اپنے مسلک کی تبلیغ کرنا اور مخالف خیالات رکھنے والوں کو تبدیلِ خیال (conversion) پر آمادہ کرنے کی کوشش کرنا ہر جماعت کا حق ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر آپ کو یہ حق حاصل ہے تو ہم کو بھی جوابی تبلیغ کا حق پہنچتا ہے۔ وطن پرستی اور اشتراکیت کی تبلیغ ہماری نگاہ میں شدھی کی تبلیغ سے کچھ بھی مختلف نہیں۔ دونوں کا نتیجہ ایک ہے اور دونوں کی مزاحمت ہمارے لئے ناگزیر ہے۔ اگر آپ اس تصادم کے لئے تیار ہیں اور اس کو ہندوستان کے مستقبل کے لئے مفید سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی سخت نادانی ہے۔

مسائل حاضرہ میں قرآن اور رسول کی رہنمائی

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (الاعراف-۱)

پیروی کرو اس ہدایت کی جو تمہاری طرف خدا کے پاس سے نازل کی گئی ہے۔ خدا کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی کرنے نہ لگو۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (آل عمران-۴)

اے نبی کہہ دو اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم کو دوست بنا لے گا۔ اور تمہیں بخش دے گا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا (الاحزاب-۳)

تمہارے لئے یقیناً اللہ کے رسول میں عمل کا اچھا نمونہ موجود ہے، جو کوئی اللہ کی رحمت کا امیدوار ہو اور آخرت کے آنے کی توقع رکھتا ہو اور اللہ کو بہت یاد رکھنے والا ہو اس کے لئے (تو پیروی کا صحیح نمونہ یہی ہے)

جو لوگ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں، یا جنھوں نے کبھی قرآن پڑھا ہے ان کی نظر سے اس کتاب پاک میں یہ آیات ضرور گذری ہوں گی۔ بہت سوں کو ان کے معانی سے بھی واقفیت ہوگی۔ خصوصاً آخری آیت سے تو کوئی وعظ اور کوئی اصلاحی خطبہ خالی نہیں ہوتا۔ مگر آج ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ایک بار پھر یہ آیات نظروں کے سامنے لائی جائیں۔ کیونکہ ایسا گمان ہوتا ہے کہ شاید ساری مسلمان قوم ان آیات کو بھول گئی ہے

مجملاً ہر مسلمان اس بات کو جانتا اور مانتا ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے ہم کو قرآن اور اسوۂ رسول ہی کا اتباع کرنا چاہئے۔ اور ہمارے لئے ہدایت انھی دو چیزوں میں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ہدایت جس کے اتباع کا حکم اس قطعیت کے ساتھ تم کو دیا گیا ہے، آیا اس کا دائرہ صرف طہارت اور استنجا، اور عبادات اور (باصطلاحِ زمانۂ حال) "مذہبی معاملات" ہی تک محدود ہے یا تمہاری زندگی کے چھوٹے اور بڑے، دینی اور دنیوی، قومی اور ملکی تمام معاملات پر حاوی ہے؟ نیز یہ ہدایت صرف اس زمانہ اور اس ملک کے لئے بھی

جس میں قرآن نازل ہوا تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے، یا درحقیقت یہ زمانی و مقامی قیود سے مبرا ہے اور اس میں ہر زمانہ اور ہر ملک کے مسلمانوں کے لئے ویسی ہی سچی اور صحیح رہنمائی موجود ہے جیسی ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے عربوں کے لئے تھی؟ اگر پہلی بات ہی تب تو نعوذ باللہ قرآن کا یہ مطالبہ ہی غلط ہے کہ سب رہنماؤں کو چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے، اور تمام دنیا کے طریقوں کو ترک کر کے صرف اس ایک شخص کے اسوہ کا اتباع کیا جائے جو ہمارے پاس قرآن لایا تھا۔ اس صورت میں تو اتباع کرنے کے بجائے تم کو اپنے ایمان ہی پر نظر ثانی کرنی پڑے گی لیکن اگر بات دوسری ہے، تو یہ کیا ماجرا ہے کہ تم وضو اور غسل کے مسائل میں، نکاح اور طلاق کے معاملات میں، ترکے اور وراثت کے مقدمات میں تو اس سرچشمۂ ہدایت کی طرف رجوع کرتے ہو۔ مگر جن مسائل کے حل پر تمہاری قوم کی زندگی و موت کا مدار ہے ان میں نہیں دیکھتے کہ قرآن تمہیں کونسا راستہ دکھاتا ہے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کس طرف تمہاری رہنمائی کرتی ہے۔

انتشار خیال و تشتت عمل ہندوستان میں ہر طرف ایک بے چینی نظر آتی ہے۔ ساری مسلمان قوم پر ایک پریشانی چھائی ہوئی ہے مستقبل کا سوال ایک وحشی ہنڈی کی طرح مسلمانوں کے سامنے آن کھڑا ہوا ہے، اور تقاضا کر رہا ہے کہ یا تو میرا معاملہ صاف کرو یا دیوالہ نکالو۔ لیکن اس قوم کا حال کیا ہے؟ جس کا جدھر منہ اٹھ رہا ہے چلا جا رہا ہے۔ اور جس کے ذہن میں جو بات آرہی ہے کہہ رہا ہے اور لکھ رہا ہے۔ کوئی مارکس اور لینن کے اسوے کو دانتوں سے پکڑے ہوئے ہے، کوئی ہٹلر اور مسولینی کی سنت پر عمل کر رہا ہے، کوئی گاندھی اور جواہر لال کے پیچھے چلا جا رہا ہے، کوئی فرائض کی پرانی فہرست میں ایک نئے فرض (جنگ آزادی) کا اضافہ کر رہا ہے، کسی پر نشستوں اور ملازمتوں کے فی صدی تناسب کا بھوت سوار ہے، کوئی حرکت اور عمل کا پجاری بنا ہوا ہے۔ اور ہانکے پکارے کہہ رہا ہے کہ اگر پشاور کی گاڑی نہیں چلتی تو راس کماری ہی کی طرف جانے والی گاڑی پر سوار ہو جاؤ، اس لئے کہ منزل مقصود کوئی نہیں، حرکت ہی فی نفسہٖ مقصود ہے۔ غرض ہر شخص جو کچھ بول سکتا ہے ایک نئی تجویز قوم کو سنا دیتا ہے۔ اور ہر شخص جو کچھ لکھ سکتا ہے ایک ماہرانہ و مبصرانہ مقالہ لکھ کر شائع کر دیتا ہے۔ مگر اس تمام شور و شغب اور اس پورے ہنگامے میں کسی کو بھی یہ یاد نہیں آتا کہ ہمارے پاس قرآن نامی بھی کوئی کتاب ہے جس نے زندگی کے ہر مسئلہ میں ہماری رہنمائی کا ذمہ لے رکھا ہے اور

ہم سے کبھی یہ بھی کہا گیا تھا کہ زندگی کے ہر معاملہ میں تمہارے لئے ایک عملی نمونہ موجود ہے۔

ہدایت صرف کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ میں ہے

مسلمانوں کو مختلف راستوں کی طرف بلایا جا رہا ہے۔ ہر راستہ کی طرف بلانے والوں میں بڑے بڑے مقدس علما ہیں۔ بڑے بڑے نامور لیڈر ہیں۔ بڑے بڑے زباں آور خطیب اور ماہرِ فنِ انشا پرداز ہیں۔ ہر وادی کے سرے پر ایسے لوگ کھڑے ہیں جن کی آزمودہ کاری مسلّم، قومی خدمت ناقابلِ انکار، اور سیاسی مہارت و بصیرت معروف و مشہور ہے۔ ہر رہنما بڑی قابلیت کے ساتھ اپنے اپنے راستے کے نشیب فراز دکھا رہا ہے۔ اور دوسرے راستوں کے خدشات بیان کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ بہت قابلِ قدر ہے، مگر مسلمان کی فطرت کہتی ہے ایتونی بشیئًا من کتاب اللہ وسنۃ رسولہٖ ان کنتم صادقین۔ میرے سامنے شخصیتوں کو نہ لاؤ۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو، عالم فاضل ہو، مفسرِ قرآن ہو، معلمِ حدیث ہو، ماہرِ سیاست ہو، عمل اور قربانی کا نمونہ ہو، اس کی حرمت میرے سر اور آنکھوں پر۔ مگر جو ہدایت وہ دے رہا ہے اگر وہ اس کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے تو میرے لئے لائقِ اتباع نہیں۔ ہاں اگر وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ میں سے کوئی دلیل اپنے پاس رکھتا ہے، تو شخصی عظمت کی آمیزش سے الگ کر کے اس کو اور صرف اس کو سامنے لاؤ۔ اس لئے کہ وہی لائقِ اتباع ہے، اسی میں سچی ہدایت ہے، اور اسی کی پیروی میں فلاح و نجات ہے۔ اس کے بتائے ہوئے راستہ میں خواہ کتنی ہی دشواریاں ہوں، کتنے ہی خدشات اور کتنے ہی نقصانات ہوں، آخری اور دیرپا اور یقینی کامیابی اسی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

آیئے آج اسی نقطۂ نظر سے قرآن اور سیرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر غور کریں کہ ہمارے اس وقت کے قومی مسائل میں اس کے اندر کیا ہدایت ہے۔ کچھ پروا نہیں اگر کوئی اس بات کو دقیانوسیت اور رجعت پسندی کہہ کر ناک بھوں چڑھائے۔ حالات جدید سہی، جغرافی ماحول مختلف سہی، مگر جس ہدایت کی طرف ہم رجوع کر رہے ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ وہ ہر زمانہ میں جدید ہے، ہر دور میں وقتی ہے، اور ہر جغرافی ماحول میں مقامی ہے۔

بعثتِ محمدی کے وقت عرب کی حالت اور حضور کا طرزِ عمل

ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت آپ کے وطن کی سیاسی حالت کیا تھی اور اس حالت میں آپ نے کیا طرزِ عمل

اختیار کیا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اس وقت عرب ہر طرف ظالم سلطنتوں سے گھرا ہوا تھا۔ اور خود ملک کے اندر ہمسایہ قوموں کا اثر بڑی حد تک نفوذ کر چکا تھا۔ آپؐ کی پیدائش سے چند ہی روز قبل حبشی فوجیں یلغار کرتی ہوئی خاص اس شہر تک پہنچ گئی تھیں جس میں آپؐ پیدا ہوئے۔ عرب کا سب سے زیادہ زرخیز صوبہ یمن پہلے حبشیوں کے اور پھر ایرانیوں کے تسلط میں جا چکا تھا۔ عرب کے جنوبی اور مشرقی سواحل ایرانیوں کے زیر اثر تھے۔ عراق عرب کا علاقہ نجد کے حدود تک ایرانیوں کے اثر میں تھا۔ شمال میں عقبہ اور معان تک بلکہ تبوک تک سلطنت روم کے اثرات پہنچے ہوئے تھے۔ دونوں ہم سایہ سلطنتیں عرب کے قبائل کو اپنی اغراض کے لئے ایک دوسرے سے لڑاتی تھیں۔ اور اندرون عرب میں اپنے اثرات پھیلا رہی تھیں۔ متعدد مرتبہ قسطنطنیہ کا قیصر مکہ کی چھوٹی سی ریاست کے معاملات میں مداخلت کر چکا تھا۔ عربی قوم کو ہر ملک گیر طاقت اپنے قبضہ میں لانا چاہتی تھی کیونکہ اس قوم کا ملک بنجر تھا مگر قوم بنجر نہ تھی۔ جہانگیری کے لئے بہترین سپاہی اس سے فراہم ہو سکتے تھے۔

ان حالات میں جب نبی صلے اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپؐ نے کیا کیا؟ اگرچہ آپؐ کو اپنے وطن اور اپنی قوم سے فطری محبت تھی۔ اور آپؐ سے بڑھ کر حریت پسند کوئی نہ تھا۔ مگر آپؐ نے ایک قوم پرست (Nationalist) یا وطن پرست (PATRIOT) کی حیثیت اختیار نہ کی۔ بلکہ ایک حق پرست اور خدا پرست کی حیثیت اختیار کی۔ آپؐ کی نگاہ میں مقدم کام یہ نہ تھا کہ اپنے اہل وطن کی قوت کو مجتمع کر کے اجنبی استیلاء کی جڑیں خاکِ وطن سے اکھاڑ پھینکیں۔ بلکہ دوسرے ہر کام سے مقدم یہ کام تھا کہ حق پرستوں کا ایک جتھا بنائیں۔ اور اس کے اندر ایسی طاقت پیدا کر دیں کہ وہ صرف عرب ہی میں نہیں، بلکہ خود روم و ایران میں بھی ظلم و عدوان کے استیلاء کا خاتمہ کر دے۔ آنحضرتؐ کے اہلِ وطن آپؐ کے بہترین اوصاف سے واقف تھے۔ انھوں نے عرب کی بادشاہی کا تاج آپؐ کے سامنے پیش کیا تھا اس شرط پر کہ آپ اپنے اس جتھے کی توسیع و تنظیم سے باز آجائیں۔ اگر آپؐ وطن پرست ہوتے تو خدمتِ وطن کا موقع اس سے بہتر اور کونسا ہو سکتا تھا؟ مگر آپؐ نے اس تاج کو ٹھکرا دیا، اور اسی کام میں لگے رہے جس کے بار آور ہونے کی کم از کم اس وقت کوئی شخص امید نہ کر سکتا تھا۔ اس وقت آپ کی جمعیت دس بارہ آدمیوں سے زیادہ نہ تھی۔ تمام ملک میں کوئی قبیلہ اور کوئی گروہ آپؐ کا ساتھی نہ تھا۔ بلکہ سب مخالف اور سخت مخالف تھے۔ ظاہر ہے

کے لحاظ سے کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اسکیم کب کامیاب ہوگی جس کو آپ لے کر اٹھے تھے۔ اس بات کا ہر وقت امکان تھا کہ واقعہ فیل کی طرح کا کوئی دوسرا واقعہ پھر پیش آجائے اور حجاز بھی یمن اور ارض غسان کی طرح اجنبی حکومت کا غلام بن جائے۔ مگر آپ نے ہر حال میں یہی ضروری سمجھا کہ پہلے حق پرستوں کی جمعیت کو منظم اور مضبوط کر لیں، پھر جیسی صورت حال ہو اس کے مطابق ملکیوں اور غیر ملکیوں کے ساتھ کوئی معاملہ کریں۔

اس کی کیا وجہ تھی؟ کیا آپ کمیونلسٹ تھے؟ کیا آپ نعوذ باللہ اپنے وطن کے غدار تھے؟ کیا خاکم بدہن آپ غیر ملکی امپیریلزم کے ایجنٹ تھے؟ ہرگز نہیں۔ تاریخ کے ناقابل انکار حقائق گواہ ہیں کہ کسی فرزند وطن نے اپنے وطن کو اتنی سربلندی عطا نہیں کی جتنی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت عرب کو نصیب ہوئی۔ اور تاریخ ہی اس بات پر بھی گواہ ہے کہ کسی داعی دین نے غیر مذاہب والوں کے ساتھ اتنے تحمل، اتنی فیاضی، اتنی رواداری، اور اتنی فراخ حوصلگی کا برتاؤ نہیں کیا۔ پھر یہ بھی دنیا کو معلوم ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے کبھی روٹیوں کی تقسیم اور منافع کے بٹوارے کا سوال ہی نہیں اٹھایا۔ آپ نے نہ کبھی مکی زندگی میں اس بنیاد پر مصالحت کی کہ ریاست قریش کے دارالندوہ اور جنگی و سیاسی عہدوں میں مسلمانوں کی اتنی نمائندگی ہو، اور نہ مدنی زندگی میں اس مسئلہ کو مدار صلح قرار دیا کہ یہود کے معاشی وسائل میں مسلمانوں کا اتنا حصہ ہو۔

اب غور کیجئے کہ جب وہاں نہ کمیونلزم تھا، نہ وطن دشمنی تھی، نہ اعدائے وطن سے ساز باز تھا، تو پھر کونسی چیز تھی جس کی بنا پر آپ نے عرب کی سیاسی نجات اور تمدنی و معاشی فلاح پر اپنی بہترین قوتوں اور ذہنیتوں کو صرف کرنے سے انکار کیا اور ہر کام سے پہلے خدا کا نام لینے والوں کی ایک طاقتور جمعیت بنانا اور زمین میں اس کا دبدبہ قائم کرنا ضروری سمجھا؟ اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نصب العین وطن پرست کے نصب العین سے بالکل مختلف تھا۔ اس نصب العین کی راہ میں باہر کے قیصر و کسریٰ اور گھر کے ابوجہل اور ابولہب دونوں یکساں سد راہ تھے۔ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے ناگزیر تھا کہ واقعات کی رفتار اور ملک کے مستقبل اور آیندہ کے امکانی خدشات سب کی طرف سے بے پروا ہو کر ایک ایسی جماعت کو منظم کیا جائے جو باطل کے غلبہ کو کسی صورت میں قائم نہ رہنے دے اور اپنی طاقت سے زمین میں ایسی حالت قائم کر دے جس میں خدا پرستانہ تہذیب امن کے ساتھ پھل

پھول سکے۔ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ۔

یہی نصب العین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان قوم کو دے گئے ہیں۔ مسلمان قوم ایک قوم ہی اس بنیاد پر بنی ہے کہ یہ نصب العین اس کے تمام افراد کا مشترک اور واحد نصب العین ہے۔ اس نصب العین کو سلب کر لیجئے، پھر مسلمان قوم کسی قوم کا نام نہیں۔ یہاں عرب اور عجم کی کوئی خصوصیت نہیں۔ زمان و مکان کا کوئی سوال نہیں۔ مسلمان اگر مسلمان ہے تو ہر حال میں یہی اس کا نصب العین ہے۔

مسلمانوں کو کس طرح جمع کیا جاسکتا ہے؟ اب ایک دوسری نظر اسی کتاب ہدایت اور اسی سیرت پاک پر ڈالئے۔

یہ جتھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا، اس کی بنیاد کسی مادرِ وطن کی فرزندی، کسی نسل انسانی کے انتساب، کسی سیاسی و معاشی مفاد کے اشتراک پر نہ تھی، بلکہ ایک مخصوص عقیدے اور ایک مخصوص طرزِ عمل پر تھی۔ اس کو جوڑنے والی طاقت خدا کی محبت اور بندگی تھی نہ کہ اغراض کی محبت اور مادی مقاصد کی بندگی۔ اس کی طرف لوگوں کو بلانے والا نعرہ اذان کا نعرہ تھا، نہ کہ وطنیت کا نعرہ۔ اس کے اجزا کو سمیٹ کر ایک بنیانِ مرصوص بنانے والی چیز ایک اَن دیکھے خدا کی عبادت تھی، نہ کہ کوئی محسوس مرئی علامت۔ اس کو حرکت میں لانے والی چیز رضائے الٰہی کی طلب تھی نہ کہ منافع مادی کی طلب۔ اس میں عمل کی گرمی پھونکنے والی قوت اعلائے کلمۃ اللہ کی خواہش تھی نہ کہ نسل و عنصر کو سربلند کرنے کی تمنا۔

اس قوم کے نفسیات دنیا سے نرالے ہیں۔ جو چیزیں دنیا کو جمع کرنے والی ہیں وہ اس قوم کو منتشر کر دینے والی ہیں۔ جو صدائیں اپنے اندر دوسروں کے لئے غیر معمولی کشش رکھتی ہیں وہ اس قوم کے دل میں الٹی نفرت پیدا کر دیتی ہیں —— جن مرئی علامتوں پر دوسرے گرویدہ ہوتے ہیں، یہ ان کے لئے کوئی جذبۂ عقیدت اپنے اندر نہیں پاتے —— جن چیزوں میں دوسروں کو گرما دینے کی طاقت ہے وہ ان کے دلوں میں الٹی سردی پیدا کر دینے کا اثر رکھتی ہیں —— جو چیزیں دوسروں کو عمل پر ابھارنے والی ہیں، وہی ان کو میدانِ عمل سے دور بھگانے والی ہیں۔ سارے قرآن کو اٹھا کر دیکھ جاؤ۔ پوری سیرت نبوی پر نظر ڈال لو۔ خلافت راشدہ کے دور سے اس زمانہ تک کی اسلامی تاریخ پڑھ لو۔ تم کو معلوم ہو جائے گا

کہ اسلام کی فطرت کیا ہے اور مسلمان قوم کا مزاج کس قسم کا ہے۔

جو قوم اس سوال پر صدیوں سے جھگڑ رہی ہے کہ نبی پر سلام بھیجتے وقت بھی کھڑا ہونا چاہئے یا نہیں کیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ "بندے ماترم" کا گیت سننے کے لئے تعظیماً کھڑی ہو گی؟ جس قوم کے دل میں بت سے عقیدت کے بجائے سخت نفرت بٹھائی گئی ہے، کیا تمھیں امید ہے کہ وہ کسی جھنڈے کو سر جھکا کر سلامی دے گی؟ جو قوم تیرہ سو برس تک خدا کے نام پر بلائی جاتی رہی ہے، کیا تم سمجھتے ہو کہ اب وہ بھارت ماتا کے نام پر پروانہ وار دوڑی چلی آئے گی؟ جس قوم کے دل میں عمل کی گرمی پیدا کرنے والا داعیہ اب تک محض اعلاء کلمۃ اللہ کا داعیہ رہا ہے، کیا تمھارا گمان ہے کہ اب معدے اور بدن کے مطالبات اس میں حرارت پھونکیں گے؟ یا کونسلوں کی نشستوں اور ملازمتوں کے تناسب کا سوال اس کے قلب کو گرما دے گا؟ جس قوم کو عقیدے اور عمل کی وحدت پر جمع کیا گیا تھا، کیا تمھارا خیال ہے کہ وہ سیاسی اور معاشی پارٹیوں میں تقسیم ہو کر کوئی طاقت ور عملی قوم بن جائے گی؟ تخیل کی بنیادوں پر نظریات کی عمارتیں اٹھانے والے جو چاہیں کہیں۔ مگر جس کسی نے قرآن اور سنت سے اسلام کے مزاج کو سمجھا ہے۔ وہ بلا تامل یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ مسلمان قوم کی فطرت جب تک بالکل مسخ نہ ہو جائے، وہ نہ تو ان محرکات سے حرکت میں آ سکتی ہے اور نہ ان جامعات کے ذریعہ سے جمع ہو سکتی ہے۔ غیر مسلم بلاشبہ ان ذرائع سے جمع ہو جائیں گے اور ان میں حرکت بھی ان محرکات سے پیدا ہو جائے گی کیونکہ ان کو جمع کرنے اور حرکت میں لانے والی کوئی اور چیز نہیں ہے۔ ان کا مذہب ان کو منتشر کرتا ہے، اور صرف وطن کی خاک ہی ان کو جمع کرتی ہے۔ ان کے معتقدات ان کے دلوں کو سرد کرنے والے ہیں۔ ان میں حرارت صرف معدے ہی کی گرمی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر مسلمان جس کو خدا کے نام پر جمع کیا گیا تھا۔ اور جس میں ایمان کی گرمی پھونکی گئی تھی، آج تم اس کو ذلیل مادی چیزوں کے نام پر جمع نہیں کر سکتے، اور نہ ادنیٰ درجہ کی خواہشات سے اس میں حرارت پیدا کر سکتے ہو۔ اس طریقہ میں اگر تم کو کامیابی نصیب ہو سکتی ہے۔ تو صرف اس وقت جب کہ تم مسلمان کو فطرتِ اسلام سے ہٹا دو اور اسے بلندیوں سے گرا کر پستیوں میں لے آؤ۔

اس کے معنی یہ نہ سمجھو کہ مسلمان وطن کا دشمن ہے۔ ہرگز نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وطن کی

اصلاح و ترقی کے لئے کیا کچھ نہیں کیا ؟ خلفائے راشدین نے وطن اور ابنائے وطن کی کیا کچھ خدمت نہ کی ؟ بعد کے مسلمان جس جس ملک میں گئے ، کیا انھوں نے اس کو جنت بنا کر نہیں چھوڑا ؟ غیر مسلم قوموں کے ساتھ فیاضانہ معاملہ کرنے میں کیا کبھی کوئی کوتاہی کی گئی ؟ پس اوپر ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان اپنے ملک یا اپنی قوم کے معاشی اور تمدنی مسائل سے بالکل بے پرواہ ہے ۔ بلکہ ہم یہ بات ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان کی اصلی قوت محرکہ یہ چیزیں نہیں ہیں ، اس کی جمعیت ان بنیادوں پر قائم نہیں ہوئی ہے ، اس میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے والی آگ یہ نہیں ہے ۔ وہ طاقت ور اور منظم ہونے کے بعد ان سب مسائل کو حل کرنے میں حصہ لے سکتا ہے اور دوسروں سے بڑھ کر حصہ لے سکتا ہے ، مگر اس کو طاقت ور اور منظم بنانے کے ذرائع یہ نہیں ہیں بلکہ کچھ اور ہیں ۔

مسلم قوم کس طرح بنائی گئی تھی

اب ایک قدم اور آگے بڑھیے ۔ یہ دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نئی قوم کن طریقوں سے بنائی تھی ، اور اس میں کن ذرائع سے وحدت اور قوتِ عمل پیدا کی تھی ۔

جس وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت لے کر اٹھے تھے تو ساری دنیا میں تنہا آپ ہی ایک مسلم تھے ۔ کوئی آپ کا ساتھی اور ہم خیال نہ تھا ۔ دنیوی طاقتوں میں سے کوئی طاقت آپ کو حاصل نہ تھی ۔ گرد و پیش جو لوگ آباد تھے ، ان میں خود سری اور انفرادیت انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی تھی ۔ ان میں سے کوئی کسی کی بات سننے اور اطاعت کرنے پر آمادہ نہ تھا ۔ وہ نسل اور قبیلہ کی عصبیت کے سوا کسی اور جمعیت کا تصور ہی نہ کر سکتے تھے ۔ ان کے ذہن ان خیالات اور مقاصد سے دور کا لگاؤ بھی نہ رکھتے تھے جن کی تبلیغ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے تھے ۔ اس ماحول اور ان حالات میں کونسی طاقت تھی جس سے ایک تنہا انسان ، بے یار و مددگار اور بے وسیلہ انسان نے ان لوگوں کو اپنی طرف کھینچا ؟ کیا آں حضرت نے عربوں کو یہ لالچ دیا تھا کہ میں تم کو زمین کی حکومت دلواؤں گا ؟ رزق کے خزانے دلواؤں گا ؟ دشمنوں پر فتح اور غلبہ بخشوں گا ؟ بیرونی غاصبوں کو نکال باہر کروں گا اور عرب کو ایک طاقتور سلطنت بنادوں گا ؟ تمہاری تجارت اور صنعت و حرفت کو ترقی دوں گا ؟ تمہارے وسائلِ معیشت بڑھاؤں گا اور تمھیں ایک ترقی یافتہ اور غالب قوم بنا کر چھوڑوں گا ؟ ظاہر ہے کہ ایسا کوئی لالچ آپ نے نہیں لایا تھا ۔ پھر

کیا آپؐ نے امیروں کے مقابلہ میں غریبوں کی، اور سرمایہ داروں اور زمینداروں کے مقابلہ میں مزدوروں اور کاشتکاروں کی حمایت کا بیڑا اٹھایا تھا؟ سیرتِ نبویؐ گواہ ہے کہ یہ چیز بھی نہ تھی۔ پھر کیا آپؐ نے کوئی سیاسی یا تعلیمی یا تمدنی یا معاشی یا فوجی تحریک اٹھائی تھی۔ اور اس کی طرف لوگوں کو کھینچنے کے لئے نفسیاتی حربوں سے کام لیا تھا۔ واقعات شاہد ہیں کہ ان میں سے بھی کوئی چیز نہ تھی۔ پھر غور کیجئے کہ آخر وہ کس چیز کی کشش تھی جس نے عربی اور عجمی، امیر اور غریب، آقا اور غلام سب کو آپؐ کی طرف کھینچا ہو۔ دنیا جانتی ہے کہ وہ صرف دو چیزیں تھیں۔ ایک قرآن کی تعلیم۔ دوسرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت۔ لوگوں کے سامنے یہ پیغام پیش کیا گیا تھا کہ لَا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔ ان کو اس بات پر جمع کیا گیا تھا کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ۔ ان کو یہ تعلیم دی گئی تھی کہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ ان کے سامنے یہ نصب العین رکھا گیا تھا کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰہُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَہَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔ پھر جس شخص نے ان کو یہ دعوت دی تھی اس کا حال یہ تھا کہ کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْاٰنَ۔ وہ جو کچھ کہتا تھا سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر خود اس پر عمل کر کے دکھاتا تھا۔ وہ فضائلِ اخلاق اور عملِ صالح کا مجسمہ تھا۔ اور اس کی زندگی میں راست بازی اور راست روی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

یہی دو چیزیں تھیں جنھوں نے ہر طرف سے لوگوں کو کھینچا اور وہ قوم بنا دی جس کا نام مسلمان ہے۔ نوعِ انسانی کے مختلف طبقوں اور گروہوں میں سے جن جن لوگوں کے لئے ان دو چیزوں میں کشش تھی وہ اس مرکز کی طرف کھنچتے چلے گئے اور انھی سے مسلمان قوم وجود میں آئی۔ دوسرے الفاظ میں اس حقیقت کو یوں سمجھئے کہ اسلامی جمعیت نام ہی اس جمعیت کا ہے جو قرآن اور سیرتِ نبویؐ کی کشش سے وجود میں آئی ہے۔ جہاں زندگی کے وہ اصول اور مقاصد ہوں گے جو قرآن نے پیش کئے ہیں۔ اور جہاں طرزِ عمل وہ ہوگا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا وہاں مسلمان جمع ہو جائیں گے، اور جہاں یہ دونوں چیزیں نہ ہوں گی وہاں ان لوگوں کے لئے قطعاً کوئی کشش نہ ہوگی۔ جو مسلمان ہیں۔

مسلمانوں کی قومی تحریکات کے ناکام ہونے کی وجہ

اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ہماری قومی تحریکات میں بنیادی نقص کونسا ہے؟ جس کی وجہ سے مسلمان کسی تحریک کی طرف بھی فوج در فوج نہیں کھنچتے اور ہر داعی کی دعوت بہرے کانوں سے سنتے ہیں۔ ان کی فطرت وہ آواز سننا چاہتی ہے اور وہ طرزِ عمل دیکھنا چاہتی ہے جس کی کشش نے ان کو ساری دنیا سے الگ ایک قوم بنایا تھا۔ مگر افسوس کہ وہ آواز کسی طرف سے آتی ہے، اور نہ وہ طرزِ عمل کہیں نظر آتا ہے۔ بلانے والے ان کو ایسے مقاصد کی طرف بلاتے ہیں جو ان کی زندگی کے اصلی مقاصد نہیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ علو اور تمکن فی الارض کی طرف آؤ۔ حالانکہ یہ مسلمان کا نصب العین نہیں ہے۔ بلکہ اپنے نصب العین (اعلائے کلمۃ اللہ) کے لئے اس کی بے غرضانہ جدوجہد کا طبعی نتیجہ ہے۔ کوئی ان کو وطن پرستی کی طرف بلاتا ہے، حالانکہ اسی چیز کو چھوڑ کر تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہوئے تھے۔ کوئی ان کو نہایت ادنیٰ درجہ کے مادی فوائد کی طرف بلاتا ہے، حالانکہ مسلمان کی نگاہ میں ان کی حیثیت متاعِ غرور سے زیادہ نہیں پھر جو لوگ مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے اٹھتے ہیں ان کی زندگی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ادنیٰ جھلک تک نظر نہیں آتی۔ کہیں کمل فرنگیت ہے۔ کہیں نہرو اور گاندھی کا اتباع ہے۔ کہیں جبوں اور عماموں میں سیاہ دل اور گندے اخلاق لپٹے ہوئے ہیں۔ زبان سے وعظ، اور عمل میں بدکاریاں۔ ظاہر میں خدمتِ دین اور باطن میں خیانتیں۔ غداریاں اور نفسانی اغراض کی بندگیاں۔ جمہور مسلمین بڑی بڑی امیدیں لے کر ہر نئی تحریک کی طرف دوڑتے ہیں۔ مگر مقاصد کی پستیاں اور عمل کی خرابیاں دیکھ کر ان کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔

خیر یہ ایک دوسری داستان ہے۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق تنظیم پر غور کیجئے۔ کہ مسلمان قوم کی تنظیم اگر ہو سکتی ہے تو اسی طریق پر ہو سکتی ہے۔

اسلامی تنظیم کے اصول

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی جمعیت اس ڈھنگ پر بنائی تھی کہ پہلے تو آپ نے انسانی گروہ میں سے صرف ان لوگوں کو چھانٹ لیا جن کی فطرت میں ایک خالص صداقت اور ایک پاک زندگی کی طرف کھنچنے کی صلاحیت تھی۔ پھر تعلیم و تربیت کے بہترین ذرائع سے کام لے کر ان میں سے ایک ایک فرد کی اصلاح فرمائی، اس کے دل میں زندگی کا ایک بلند مقصد بٹھا دیا، اور اس کے کیرکٹر میں اتنی مضبوطی پیدا کی کہ وہ اس مقصد کے لئے جم کر جدوجہد کرے اور کسی فائدہ کا لالچ یا کسی نقصان کا خوف اسے اس مقصد

کی راہ سے نہ ہٹا سکے۔ اس کے بعد ان افراد کو ملا کر ایک جماعت بنا دیا تاکہ افراد میں جو کچھ کمزوریاں باقی رہ جائیں جماعت کی طاقت ان کو دور کر دے۔ اجتماعی ماحول ایسا بن جائے جس میں نیکیاں پرورش پائیں۔ اور برائیاں ابھر نہ سکیں۔ افراد اپنے مقصدِ حیات کی تکمیل میں ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔ اور اجتماعی طاقت سے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اس تعمیر کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی ماہرِ فن انجینیر اینٹوں کے ڈھیر میں سے چھانٹ کر بہترین اینٹیں لے، پھر اس کو اس طرح پکائے کہ ایک ایک اینٹ بجائے خود پختہ ہو جائے پھر ان سب کو نہایت عمدہ سیمنٹ سے جوڑ کر ایک مستحکم عمارت بنا دے۔

اس تنظیم کے بڑے بڑے اصول یہ تھے:۔

۱۔ جماعت کے تمام افراد کم از کم دین کے جوہر سے واقف ہوں تاکہ وہ کفر و اسلام میں تمیز کر کے اسلام کے طریقہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہ سکیں۔

۲۔ اجتماعی عبادات کے ذریعہ سے افراد میں اخوت، مساوات اور تعاون کی اسپرٹ پیدا کی جائے۔

۳۔ جماعت کے تمدن و معاشرت میں ایسے امتیازی خصائص اور حدود مقرر کئے جائیں جن سے وہ دوسری اقوام میں خلط ملط نہ ہو سکیں اور باطنی و ظاہری دونوں حیثیتوں سے ایک الگ قوم بنے رہیں۔ اسی لئے تشبہ بالاجانب کی سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی۔

۴۔ تمام اجتماعی ماحول پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر چھایا رہے۔ تاکہ جماعت کے دائرہ میں کوئی انحراف اور کوئی بغاوت راہ نہ پا سکے۔ سرکشی کا پہلا اثر ظاہر ہوتے ہی اس کا استیصال کر دیا جائے اور منافقین کے ساتھ غلظت اور شدت کا ایسا برتاؤ ہو کہ یا تو وہ جماعت سے نکل جائیں یا اگر رہیں تو کوئی فتنہ نہ اٹھا سکیں۔

۵۔ پوری مسلمان قوم ایک انجمن ہو اور ہر مسلمان مرد اور عورت کو مجرد اسلامی حق کی بنا پر اس کی رکنیت کا مساویانہ مرتبہ حاصل ہو۔ ایسے تمام انتسابات اور امتیازات کو مٹا دیا جائے جو مسلم اور مسلم میں تفریق کرتے ہوں۔ ہر فردِ مسلم کو قومی معاملات میں حصہ لینے اور رائے دینے کا پورا حق حاصل ہو حتیٰ کہ ایک غلام بھی کسی کو امان دے دے تو وہ پوری قوم کی طرف سے امان ہو۔

۶۔ جماعت کے تمام افراد ایک نصب العین پر متحد ہوں اور اس کے لئے جد و جہد اور قربانی کرنے کا جذبہ ان میں موجود ہو۔ ایک گروہ صرف اسی نصب العین کی خدمت کے لئے وقف رہے اور بقیہ افرادِ جماعت اپنی معاش کے لئے جد و جہد کرنے کے ساتھ ساتھ پہلے گروہ کی ہر ممکن طریقہ سے مدد کرتے رہیں اور مجموعی طور سے پوری جماعت اور اس کے ہر ہر فرد کے دل میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہو کہ اس کی زندگی کا اصل مقصود روزی کمانا نہیں بلکہ اسی ایک نصب العین کی خدمت کرنا ہے۔

تنظیم کے یہی اصول تھے جن سے وہ زبردست جماعت پیدا ہوئی جو دیکھتے دیکھتے آدھی دنیا پر چھا گئی۔

—— اس طریق تنظیم کی رفتار ابتداء میں بہت سست تھی۔ حتی کہ پندرہ برس تک وہ چند سینکڑوں سے زیادہ افراد کو اپنے دائرے میں نہ لا سکی۔ مگر اس میں یہ قاعدہ مدنظر رکھا گیا تھا کہ توسیع (Expansion) کے ساتھ استحکام (Consolidation) بھی ہوتا رہے۔ اس لئے یہ نظام جماعت جتنا پھیلتا گیا اتنا ہی مضبوط ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ جب ایک معتدبہ جماعت اس طریق پر منظم ہو گئی تو وہ اتنی طاقت کے ساتھ اٹھی کہ دنیا کی کوئی چیز اس کے سیل رواں کو نہ روک سکی —— قرآن مجید میں اس کی چھوٹی سی ابتداء، پھر تدریجی ترقی، پھر غیر معمولی شان و شوکت کے ساتھ اس کے ظہور کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْأَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ۔

مسلمان قوم کے مزاج کے ساتھ یہی طریق تنظیم مناسبت رکھتا ہے۔ یہ قوم تو پہلے ہی سے ایک جمعیت ہے —— اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ نام سے بنانا، اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی دروئی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا، اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا یہ دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے —— لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہل مغرب سے لے لئے ہیں، مگر ان کو معلوم نہیں ہے کہ جو چیزیں دوسری قوموں کے مزاج کو راس آتی ہیں وہ مسلمان قوم کے مزاج کو موافق نہیں آتیں۔ اس قوم کو اگر کوئی چیز راس آسکتی ہے تو ایک ایسی جمہوری تحریک ہے جو پوری قوم کو ایک انجمن سمجھ کر شروع کی جائے۔ اور جس میں توسیع و استحکام کے اسی تناسب کو ملحوظ رکھا جائے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملحوظ رکھا تھا۔ آپ اگر کچے اور کمزور مسالے سے وسیع سطح پر ایک عمارت کھڑی کر دیں گے اور اس سے قلعے کا کام لینا چاہیں گے تو لامحالہ وہ سیل حوادث کی ایک ٹکر بھی جھیل سکے گی۔

اسلام ایک جامع تہذیب کی حیثیت سے

دین و دنیا کی علیحدگی کا جاہلی تصور اور اس کے اثرات ہماری قومی سیاست میں

مذہب کا جاہلی تصور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا میں مذہب کا عام تصور یہ تھا کہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں سے یہ بھی ایک شعبہ ہے، یا دوسرے الفاظ میں یہ انسان کی دنیوی زندگی کے ساتھ ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ بعد کی زندگی میں نجات کے لئے ایک سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئے اس کا تعلق کلیۃً صرف اس رشتہ سے ہے جو انسان اور اس کے معبود کے درمیان ہے۔ جس شخص کو نجات کے بلند مرتبے حاصل کرنے ہوں اس کے لئے تو ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے تمام دوسرے شعبوں سے بے تعلق ہو کر صرف اسی ایک شعبہ کا ہو جائے۔ مگر جس کو اتنے بڑے مراتب مطلوب نہ ہوں بلکہ نجات مطلوب ہو، اور اس کے ساتھ یہ خواہش بھی ہو کہ معبود اس پر نظر عنایت رکھے اور ان کو دنیوی معاملات میں برکت عطا کرتا رہے اس کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ اپنی دنیوی زندگی کے ساتھ اس ضمیمہ کو بھی لگائے رکھے۔ دنیا کے سارے کام اپنے ڈھنگ چلتے رہیں اور ان کے ساتھ چند مذہبی رسموں کو ادا کر کے معبود کو بھی خوش کیا جاتا رہے۔ انسان کا تعلق خود اپنے نفس سے، اپنے ابنائے نوع سے، اپنے گردوپیش کی ساری دنیا سے ایک الگ چیز ہے، اور اس کا تعلق اپنے معبود سے ایک دوسری چیز ان دونوں کے درمیان کوئی ربط نہیں۔

یہ جاہلیت کا تصور تھا اور اس کی بنیاد پر کسی انسانی تہذیب و تمدن کی عمارت قائم نہ ہو سکتی تھی۔ تہذیب و تمدن کے معنی انسان کی پوری زندگی کے ہیں، اور جو چیز انسان کی زندگی کا محض ایک ضمیمہ ہو ...... اس پر پوری زندگی کی عمارت، ظاہر ہے کہ کسی طرح قائم نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ

دنیا میں ہر جگہ مذہب اور تہذیب و تمدن ہمیشہ ایک دوسرے سے الگ رہے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے پر تھوڑا یا بہت اثر ضرور ڈالا، مگر یہ اثر اس قسم کا تھا جو مختلف اور متضاد چیزوں کے یکجا ہونے سے مترتب ہوتا ہے اس لئے یہ اثر کہیں بھی مفید نظر نہیں آتا۔ مذہب نے تہذیب و تمدن پر جب اثر ڈالا تو اس میں رہبانیت، مادی علائق سے نفرت، لذائذ دنیوی سے کراہت، عالم اسباب سے بے تعلقی، انسانی تعلقات میں انفرادیت، تنافر اور تعصب کے عناصر داخل کر دیئے۔ یہ اثر کسی معنی میں بھی ترقی پرور نہ تھا بلکہ دنیوی ترقی کی راہ میں انسان کے لئے ایک سنگ گراں تھا۔ دوسری طرف تہذیب و تمدن نے جس کی بنیاد سراسر مادیت اور خواہشات نفس کے اتباع پر قائم تھی، مذہب پر جب کبھی اثر ڈالا اس کو گندہ کر دیا۔ اس نے مذہب میں نفس پرستی کی تمام نجاستیں داخل کر دیں، اور اس سے ہمیشہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی کہ ہر اس گندی اور بدتر سے بدتر چیز کو جسے نفس حاصل کرنا چاہے، مذہبی تقدس کا جامہ پہنا دیا جائے تاکہ نہ خود اپنا ضمیر ملامت کرے، نہ کوئی دوسرا اس کے خلاف کچھ کہہ سکے۔ اسی چیز کا اثر ہے کہ بعض مذاہب کی عبادتوں تک میں ہم کو لذت پرستی اور بے حیائی کے ایسے طریقے ملتے ہیں۔ جن کو مذہبی دائرے کے باہر خود ان مذاہب کے پیرو بھی بداخلاقی سے تعبیر کرنے پر مجبور ہیں۔

مذہب اور تہذیب کے اس تعامل سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یہ حقیقت بالکل نمایاں نظر آتی ہے، کہ دنیا میں ہر جگہ تہذیب و تمدن کی عمارت غیر مذہبی اور غیر اخلاقی دیواروں پر قائم ہوئی ہے۔

سچے مذہبی لوگ اپنی نجات کی فکر میں دنیا سے الگ رہے۔ اور دنیا کے معاملات کو دنیا والوں نے اپنی خواہشات نفس اور اپنے ناقص تجربات کی بنا پر ــــ جن کو ہر زمانہ میں کامل سمجھا گیا اور ہر زمانہ مابعد میں ناقص ہی ثابت ہوئے ــــ جس طرح چاہا چلایا اور اس کے ساتھ اگر ضرورت سمجھی تو اپنے معبود کو خوش کرنے کے لئے کچھ مذہبی رسمیں بھی ادا کر لیں۔ مذہب چونکہ ان کے لئے محض زندگی کا ایک ضمیمہ تھا۔ اس لئے اگر وہ ساتھ رہا بھی تو محض ایک ضمیمہ ہی کی حیثیت سے رہا۔ ہر قسم کے سیاسی ظلم و ستم، ہر قسم کی معاشی بے انصافیوں، ہر قسم کی معاشرتی بے اعتدالیوں اور ہر قسم کی تمدنی کج راہیوں کے ساتھ یہ ضمیمہ منسلک ہو سکتا تھا۔ اس نے جنگی، اور قزاقی کا بھی ساتھ دیا، جہاں سوزی اور غارتگری کا بھی، سود خواری اور قارونیت کا بھی، فحش کاری اور بدچلنی کا بھی۔

مذہب کا اسلامی تصور محمد صلے اللہ علیہ وسلم جس غرض کے لئے بھیجے گئے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ مذہب کے اس جاہلی تصور کو مٹا کر ایک عقلی و فکری تصور پیش کریں، اور صرف پیش ہی نہ کریں بلکہ اسی کی اساس پر تہذیب و تمدن کا ایک مکمل نظام قائم کر کے اور کامیابی کے ساتھ چلا کر دکھا دیں۔ آپؐ نے بتایا کہ مذہب قطعاً بے معنی ہے، اگر وہ انسان کی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیمہ ہے۔ ایسی چیز کو دین و مذہب کے نام سے موسوم کرنا ہی غلط ہے۔ بحقیقت میں دین وہ ہے جو زندگی کا ایک جز نہیں بلکہ تمام زندگی ہو، زندگی کی روح اور اس کی قوت محرکہ ہو، فہم و شعور اور فکر و نظر ہو، صحیح و غلط میں امتیاز کرنے والی کسوٹی ہو، زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر راہِ راست اور راہِ کج کے درمیان فرق کر کے دکھائے، راہِ کج سے بچائے، راہِ راست پر استقامت اور پیش قدمی کی طاقت بخشے، اور زندگی کے اس لاانتہاہی سفر میں، جو دنیا سے لے کر آخرت تک مسلسل چلا جا رہا ہے، انسان کو ہر مرحلے سے کامیابی و سعادت کے ساتھ گذار دے۔

اسی مذہب کا نام اسلام ہے۔ یہ زندگی کا ضمیمہ بننے کے لئے نہیں آیا ہے، بلکہ اس کے آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اگر اس کو بھی پرانے جاہلی تصور کے ماتحت ایک ضمیمۂ زندگی قرار دیا جائے۔ یہ جس قدر خدا اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے اسی قدر انسان اور انسان کے تعلق سے بھی کرتا ہے، اور اسی قدر انسان اور ساری کائنات کے تعلق سے بھی۔ اس کے آنے کا اصل مقصد انسان کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ تعلقات کے یہ شعبے الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف و بیگانہ نہیں ہیں، بلکہ ایک مجموعہ کے مربوط اور مرتب اجزا ہیں اور ان کی صحیح ترکیب ہی پر انسان کی فلاح کا مدار ہے۔ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اور خدا کا تعلق درست نہ ہو۔ اسی طرح انسان اور خدا کا تعلق بھی درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہ ہو۔ پس یہ دونوں تعلق ایک دوسرے کی تکمیل و تصحیح کرتے ہیں اور دونوں مل کر ایک کامیاب زندگی بناتے ہیں، اور مذہب کا اصل کام اسی کامیاب زندگی کے لیے انسان کو ذہنی و عملی حیثیت سے تیار کرنا ہے۔ جو مذہب یہ کام نہیں کرتا وہ مذہب ہی نہیں ہے اور جو اس کام کو انجام دیتا ہے وہی اسلام ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے"۔

اسلام ایک خاص طرزِ فکر (Attitude of mind) اور پوری زندگی کے متعلق ایک خاص

نقطۂ نظر (Outlook on life) ہے۔ پھر وہ ایک خاص طرزِ عمل ہے جس کا راستہ اسی طریقِ فکر اور اسی نظریۂ زندگی سے متعین ہوتا ہے۔ اس طریقِ فکر اور طرزِ عمل سے جو ہیئت حاصل ہوتی ہے وہی مذہب اسلام ہے، وہی تہذیب اسلامی ہے، اور وہی تمدنِ اسلامی ہے۔ یہاں مذہب اور تہذیب و تمدن الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ سب مل کر ایک مجموعہ بناتے ہیں۔ وہی ایک طریقِ فکر اور نظریۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر مسئلہ کا تصفیہ کرتا ہے۔ انسان پر خدا کے کیا حقوق ہیں۔ خود اس کے اپنے نفس کے کیا حقوق ہیں۔ ماں باپ کے، بیوی بچوں کے، عزیزوں اور قرابت داروں کے، پڑوسیوں اور معاملہ داروں کے، ہم مذہبوں اور غیر مذہب والوں کے، دشمنوں اور دوستوں کے، ساری نوعِ انسانی کے، حتیٰ کہ کائنات کی ہر چیز اور قوت کے کیا حقوق ہیں؟ وہ ان تمام حقوق کے درمیان کامل توازن اور عدل قائم کرتا ہے، اور ایک شخص کا مسلمان ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ وہ ان تمام حقوق کو پورے انصاف کے ساتھ ادا کرے گا، بغیر اس کے کہ ظلم کی راہ سے ایک حق کو دوسرے حق پر قربان کرے۔

پھر یہی طریقِ فکر اور نظریۂ حیات انسان کی زندگی کا ایک بلند اخلاقی نصب العین اور ایک پاکیزہ روحانی منتہائے نظر متعین کرتا ہے، اور زندگی کی تمام سعی و جہد کو، خواہ وہ کسی میدان میں ہو، ایسے راستوں پر ڈالنا چاہتا ہے جو ہر طرف سے اسی ایک مرکز کی طرف راجع ہوں۔

یہ مرکز ایک فیصلہ کن چیز ہے۔ اسی کے لحاظ سے ہر شے کی قدر (value) متعین کی جاتی ہے۔ اسی معیار پر ہر شے کو پرکھا جاتا ہے۔ جو شے اس مرکزی مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہوتی ہے، اسے اختیار کر لیا جاتا ہے، اور جو شے سدِ راہ ہوتی ہے اسے رد کر دیا جاتا ہے۔ فرد کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر جماعت کی زندگی کے بڑے سے بڑے معاملات تک یہ معیار یکساں کارفرما ہے۔ وہ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ ایک شخص کو، کل و شرب میں، لباس میں، صنفی تعلقات میں، لین دین میں، بات چیت میں، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں کن حدود کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ وہ مرکزِ مقصود کی طرف جانے والی سیدھی راہ پر قائم رہے، اور ٹیڑھے راستوں پر نہ پڑ جائے۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں افراد کے باہمی روابط کن اصولوں پر مرتب کیے جائیں جن سے معاشرت، معیشت، سیاست، غرض ہر شعبۂ زندگی کا

ارتقاء ایسے راستوں پر ہو، جو اصل منزل مقصود کی طرف جانے والے ہوں، اور وہ راہیں نہ اختیار کرے جو اس سے دور ہٹانے والی ہوں۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ زمین و آسمان کی جن قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو اور جو چیزیں اس کے لئے مسخر کی جائیں ان کو وہ کن طریقوں سے استعمال کرے، تاکہ وہ اس کے مقصد کی خادم بن جائیں، اور کن طریقوں سے اجتناب کرے تاکہ وہ اس کی کامیابی میں مانع نہ ہوں۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اسلامی جماعت کے لوگوں کو غیر اسلامی جماعتوں کے ساتھ دوستی میں اور دشمنی میں، جنگ میں اور صلح میں، اشتراک اغراض میں اور اختلاف مقاصد میں، غلبہ کی حالت میں اور مغلوبی کے دور میں، علوم و فنون کے اکتساب میں، اور تہذیب و تمدن کے لین دین میں کن اصولوں کو ملحوظ رکھنا چاہئے تاکہ خارجی تعلقات کے ان مختلف پہلوؤں میں وہ اپنے مقصد کی راہ سے ہٹنے نہ پائیں بلکہ جہاں تک ممکن ہو بنی نوع انسان کے ان نادان اور گمراہ افراد سے بھی طوعاً یا کرہاً شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر اس مقصد کی خدمت لیں، جو اصل فطرت کے اعتبار سے ان کا بھی ویسا ہی مقصد ہے جیسا کہ پیروانِ اسلام کا ہے۔

غرض وہ ایک ہی نقطۂ نظر ہے، جو مسجد سے لے کر بازار اور میدان کارزار تک، طریق عبادت سے لے کر ریڈیو اور ہوائی جہاز کے طریق استعمال تک، غسل و وضو اور طہارت و استنجاء کے جزوی مسائل سے لے کر اجتماعیات، معاشیات، سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے بڑے سے بڑے مسائل تک، مکتب کی ابتدائی تعلیم سے لے کر آثارِ فطرت کے انتہائی مشاہدات اور قوانین طبعی کی بلند ترین تحقیقات تک، زندگی کی تمام مساعی اور فکر و عمل کے تمام شعبوں کو ایک ایسی وحدت بناتا ہے جس کے اجزاء میں ایک مقصدی ترتیب اور ایک ارادی ربط پایا جاتا ہے، اور ان سب کو ایک مشین کے پرزوں کی طرح اس طرح جوڑتا ہے، کہ ان کی حرکت اور تعامل سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہو۔

مذہب کی دنیا میں یہ ایک انقلابی تصور تھا، اور جاہلیت کے خمیر سے بنے ہوئے دماغوں کی گرفت میں یہ تصور کبھی پوری طرح نہ آسکا۔ آج دنیا علم و عقل کے اعتبار سے چھٹی صدی عیسوی کے مقابلہ میں کس قدر آگے بڑھ چکی ہے مگر آج بھی اتنی قدامت پرستی اور تاریک خیالی موجود ہے، کہ یورپ کی شہرۂ آفاق یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائے ہوئے لوگ بھی اس انقلاب انگیز تصور کے ادراک سے

اسی طرح عاجز ہیں جس طرح قدیم جاہلیت کے ان پڑھ اور کودن لوگ تھے۔ ہزاروں برس سے مذہب کا جو غلط تصور وراثت میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے اس کی گرفت دماغوں پر ابھی تک مضبوط جمی ہوئی ہے عقلی تنقید اور علمی تحقیق کی بہترین تربیت سے بھی اس کے بند نہیں کھلتے۔ خانقاہوں اور مسجدوں کے تاریک حجروں میں رہنے والے اگر مذہبیت کے معنی گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کے سمجھیں اور دینداری کو عبادات کے دائرے میں محدود خیال کریں تو جائے تعجب نہیں، کہ وہ تو ہیں ہی تاریک خیال۔ جاہل عوام اگر مذہب کو باجے، تعزیے اور گائے کے سوالات میں محدود سمجھیں تو یہ بھی مقامِ حیرت نہیں کہ وہ تو ہیں ہی جاہل۔ مگر یہ ہمارے پروردگانِ نورِ علم کو کیا ہوا کہ ان کے دماغوں سے بھی قدامت پرستی کی ظلمت دور نہیں ہوتی؟ وہ بھی مذہب، اسلام کو انھی معنوں میں ایک مذہب سمجھتے ہیں جن میں ایک غیر مسلم اپنے قدیم جاہلی تصور کے تحت سمجھتا ہے۔

ہماری سیاست میں جاہلی تصور کے اثرات

فہم و ادراک کے اس قصور کی وجہ سے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک بڑا حصہ نہ صرف خود غلط روش پر چل رہا ہے، بلکہ دنیا کے سامنے اسلام اور اس کی تہذیب و تمدن کی نہایت غلط نمائندگی کر رہا ہے۔ مسلم جماعت کے اصلی مسائل جن کے حل پر اس کی حیات و ممات کا مدار ہے، سرے سے ان لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتے۔ اور یہ ضمنی غیر متعلق مسائل کو اصل مسائل سمجھ کر عجیب عجیب طریقوں سے ان کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ مذہب کا پرانا محدود تصور ہی ہے، جو مختلف شکلوں میں ظہور کر رہا ہے۔

کوئی صاحب فرماتے ہیں، کہ میں پہلے ہندوستانی ہوں، پھر مسلمان، اور یہ کہتے وقت ان کے ذہن میں مذہب کا یہ تصور ہوتا ہے، کہ اسلام جغرافی تقسیم قبول کر سکتا ہے۔ ترکی اسلام، ایرانی اسلام، مصری اسلام، ہندوستانی اسلام، اور پھر پنجابی، بنگالی، دکنی، اور مدراسی اسلام الگ الگ ہو سکتے ہیں، ہر جگہ مسلمان اپنے اپنے مقامی حالات کے لحاظ سے ایک الگ طریقِ فکر اختیار کر سکتا ہے، ہر ملک کا ایک جداگانہ نقطۂ نظر اور نصب العین قبول کر سکتا ہے، ان تمام سیاسی، معاشی اور اجتماعی نظاموں میں جذب ہو سکتا ہے، جو مختلف قوموں نے مختلف اصولوں پر قائم کیے ہیں، اور پھر بھی وہ مسلمان

رہ سکتا ہے، اس لئے کہ اسلام ایک مذہبی ضمیمہ ہے جو دنیوی زندگی کے ہر ڈھنگ اور ہر طریقہ کے ساتھ چسپاں ہو سکتا ہے۔

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو دین اور دنیا کے معاملات میں واضح امتیاز کرنا چاہئے۔ دین کا تعلق ان معاملات سے ہے جو انسان اور خدا کے درمیان ہیں، یعنی اعتقادات اور عبادات ان کی حد تک مسلمان اپنی راہ پر چل سکتے ہیں، اور کوئی ان کو اس راہ سے نہ ہٹانا چاہتا ہے نہ ہٹا سکتا ہے۔ رہے دنیوی معاملات، تو ان میں دین کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں جس طرح دنیا کے دوسرے لوگ ان کو انجام دیتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کو بھی انجام دینا چاہئے۔

ایک تیسرے صاحب کا ارشاد ہے کہ اپنے مذہبی، تمدنی اور لسانی حقوق کے لئے مسلمانوں کو بلاشبہ ایک مشترک نظام کی ضرورت ہے مگر سیاسی اور معاشی اغراض کے لئے ان کو الگ جماعت بندی کی ضرورت نہیں۔ ان معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق بالکل غیر حقیقی اور مصنوعی ہے، یہاں مسلمانوں کے مختلف طبقوں کو اپنے اپنے مفاد اور اپنی اپنی اغراض کے لحاظ سے ان مختلف جماعتوں میں شامل ہونا چاہئے جو غیر مذہبی اصولوں پر سیاسی و معاشی مسائل کو حل کرنے کی جد و جہد کر رہی ہیں۔

ایک اور صاحب جو مسلم قوم کے تنِ مردہ میں جان ڈالنے کے لئے اٹھے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ اصل چیز ایمان باللہ اور اعتقاد یوم آخر اور اتباعِ کتاب و سنت نہیں ہے، بلکہ عناصر کی تسخیر اور قوانینِ طبعی کی دریافت اور نظم و ضبط کی طاقت سے ان عناصر مسخرہ و قوانین معلومہ کو استعمال کرنا ہے تاکہ نتیجہ میں علو اور تمکن فی الارض حاصل ہو۔ یہ صاحب مادی ترقی کو مقصود بالذات قرار دیتے ہیں، اس لئے جو وسائل اس ترقی میں مددگار ہوں، وہی ان کے نزدیک اصلی اہمیت رکھتے ہیں۔ باقی رہا وہ ذہن جو علم و عقل کی تہ میں کام کرتا ہے، اور جو اپنے طریق فکر اور زاویۂ نظر کے لحاظ سے وسائلِ ترقی کے استعمال کا مقصد اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا راستہ اور تمکن فی الارض کا مدعا متعین کرتا ہے، سو وہ ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا ــــــ وہ ذہن چاہے جاپانی ذہن ہو، یا جرمن، یا اطالوی یا فاروقی خالدی، ان کو اس سے کوئی بحث نہیں۔ ان کے نزدیک یہ سب یکساں "اسلامی ذہن" ہیں،

کیونکہ ان سب کے عمل کا نتیجہ ان کو ایک ہی نظر آتا ہے، یعنی علو اور تمکن فی الارض۔ ان کی نگاہ میں جس کو زمین کی وراثت حاصل ہے، وہی "صالح" ہے، اگرچہ وہ ابراہیمؑ کے مقابلہ میں نمرود ہی کیوں نہ ہو۔ جو غالب اور بالادست ہے، وہی "مومن" ہے۔ اگرچہ وہ مسیحؑ کے مقابلہ میں بت پرست رومی فرماں روا ہی کیوں نہ ہو۔

ایک بڑا گروہ جو مسلمانوں کے قومی حقوق کی حفاظت کے لئے اٹھا ہے۔ اس کے نزدیک اسلام اور اس کی تہذیب کی حفاظت صرف اس چیز کا نام ہے، کہ ان کے مذہب اور "پرسنل لا" کی حفاظت کا اطمینان دلایا جائے، ان کی زبان کو اپنے رسم الخط سمیت ایک سرکاری زبان تسلیم کرایا جائے اور جن لوگوں کی شخصیت پر اسلام کا لیبل لگا ہوا ہو، صرف انہی کو مسلمانوں کی نمایندگی کا حق حاصل ہو۔ انتخابی اداروں اور سرکاری ملازمتوں میں متناسب نمایندگی ان کے نزدیک سب سے بڑی اہمیت رکھتی ہے، اور اگر یہ فیصلہ کر دیا جائے، کہ خالص اسلامی مسائل میں کوئی تصفیہ اس وقت تک نہ ہوگا جب تک خود مسلمان نمایندوں کی غالب اکثریت اس کو قبول نہ کرے، تو ان کے نزدیک گویا اسلامی حقوق کا پورا پورا تحفظ ہو گیا۔

دیکھا آپ نے! شکلیں کس قدر مختلف ہیں، مگر حقیقت ان سب میں ایک ہے۔ یہ سب مختلف مظاہر ہیں، اسی جاہلی تصور مذہب کے جو اسلامی تصور مذہب کے خلاف ہر زمانہ میں نت نئی شکلوں کے ساتھ بغاوت کرتا رہا ہے۔

اگر یہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ مسلم کسے کہتے ہیں اور حقیقی معنی میں اسلامی جماعت کا اطلاق کس گروہ پر ہوتا ہے، تو ان کی تمام غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔ قانونی حیثیت سے ہر وہ شخص مسلم ہے جو کلمہ طیبہ کا زبانی اقرار کرے اور ضروریات دین کا منکر نہ ہو۔ لیکن اس معنی میں جو شخص مسلم ہے، اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہے، ہم اس کو کافر نہیں کہہ سکتے، نہ وہ حقوق دینے سے انکار کر سکتے ہیں جو مجرد اقرار اسلام سے اس کو مسلم سوسائٹی میں حاصل ہوتے ہیں۔ یہ اصل اسلام نہیں ہے بلکہ اسلام کی سرحد میں داخل ہونے کا پروانہ ہے۔ اصل اسلام یہ ہے کہ تمہارا ذہن اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے۔ تمہارا طریق فکر وہی ہو، جو قرآن کا طریق فکر ہے۔ ——— زندگی اور اس کے تمام معاملات پر تمہاری

نظروہی ہو، جو قرآن کی نظر ہی ——— تم اشیار کی قدریں (Values) اسی معیار کے مطابق معین کرو، جو قرآن نے اختیار کیا ہے، تمہارا انفرادی و اجتماعی نصب العین وہی ہو، جو قرآن نے پیش کیا ہے ——— تم اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں مختلف طریقوں کو چھوڑ کر ایک طریقہ اسی معیار انتخاب کی بنا پر انتخاب کرو، جو قرآن اور طریق محمدی کی ہدایت سے تم کو ملا ہے۔

اگر تمہارے ذہن کو یہ چیز اپیل نہیں کرتی اور تمہارے نفسیات قرآن کے نفسیات کے سانچے میں ڈھلنا قبول نہیں کرتے، تو کوئی تم کو دائرۂ اسلام میں آنے یا رہنے پر مجبور نہیں کرتا۔ عقل اور راستبازی کا اقتضاء یہ ہے کہ تم اس دائرے کے باہر اپنے لئے مناسب جگہ تلاش کرنی چاہئے۔ لیکن اگر تمہارا ذہن اس چیز کو قبول کرتا ہے اور تم اپنے نفسیات کو قرآنی نفسیات کے ساتھ متحد کر لیتے ہو، تو پھر زندگی کے کسی معاملہ میں بھی تمہارا راستہ اس راستہ سے الگ نہیں ہو سکتا، جسے قرآن سبیل المومنین کہتا ہے۔

اسلامی ذہن یا قرآنی ذہن ——— کہ حقیقت میں ایک ہی چیز ہے ——— جس نظریۂ زندگی کے تحت چند اعتقادات پر ایمان لاتا ہے، چند عبادات تجویز کرتا ہے، چند شعائر (جو عام اصطلاح میں "مذہبی شعائر" کہے جاتے ہیں) اختیار کرتا ہے، ٹھیک اسی نظریہ کے تحت وہ کھانے کی چیزوں میں، پہننے کے سامان میں، لباس کی وضعوں میں، معاشرت کے طریقوں میں، تجارتی لین دین میں، معاشی بندوبست میں، سیاست کے اصولوں میں، تمدن و تہذیب کے مختلف مظاہر میں، مادی وسائل اور قوانین طبعی کے علم کو استعمال کرنے کے مختلف طریقوں میں بعض کو رد کرتا ہے، اور بعض کو اختیار کرتا ہے۔ یہاں چونکہ نقطۂ نظر ایک ہے، طریق فکر ایک ہے، نصب العین ایک ہے، ترک و اختیار کا معیار ایک ہے، اس لئے زندگی بسر کرنے کے طریقے، سعی و جہد کے راستے، معاملات دنیا کی انجام دہی کے اصول الگ نہیں ہو سکتے۔ جزئیات میں عمل کی شکلیں الگ ہو سکتی ہیں، احکام کی تعبیروں اور فروعات پر اصول کے انطباق میں تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے، ایک ہی ذہن کی کارفرمائی مختلف مظاہر اختیار کر سکتی ہے، لیکن یہ اختلاف عوارض کا اختلاف ہے، جوہری اختلاف ہرگز نہیں ہے جس بنیاد پر اسلام میں زندگی کی پوری اسکیم مرتب کی گئی ہے، اور اس کے تمام شعبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے وہ کسی قسم کا اختلاف قبول نہیں کرتی۔ آپ خواہ ہندوستانی ہوں یا ترکی، یا مصری، اگر آپ مسلمان ہیں تو

یہی اسکیم اپنی اسی اسپرٹ کے ساتھ آپ کو اختیار کرنی پڑے گی۔ اور ہر اس اسکیم کو رد کردینا پڑے گا جو اپنی اسپرٹ اور اپنے اصولوں کے لحاظ سے اس کے خلاف ہو۔

یہاں آپ "مذہبی" اور "دنیوی" شعبوں کو ایک دوسرے سے الگ کر ہی نہیں سکتے۔ اسلام کی نگاہ میں دنیا اور آخرت دونوں ایک ہی مسلسل زندگی کے دو مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ سعی وعمل کا ہے اور دوسرا مرحلہ نتائج کا ـــــ آپ زندگی کے پہلے مرحلے میں دنیا کو جس طرح برتیں گے، دوسرے مرحلے میں ویسے ہی نتائج ظاہر ہوں گے ـــــ اسلام کا مقصد آپ کے ذہن اور آپ کے عمل کو اس طرح تیار کرنا ہے، کہ زندگی کے اس ابتدائی مرحلے میں آپ دنیا کو صحیح طریقہ سے برتیں تاکہ دوسرے مرحلہ میں صحیح نتائج حاصل ہوں۔ پس یہاں پوری دنیوی زندگی "مذہبی زندگی" ہے، اور اس میں اعتقادات وعبادات سے لے کر تمدن و معاشرت اور سیاست و معیشت کے اصول و فروع تک ہر چیز ایک معنوی اور مقصدی ربط کے ساتھ مربوط ہے۔ اگر آپ اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو اسلام کی تجویز کردہ اسکیم کے بجائے کسی اور اسکیم کے مطابق منظم کرنا چاہتے ہیں، تو یہ جزوی ارتداد ہے، جو آخرکار کلی ارتداد پر منتہی ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اسلامی تعلیمات کا تجزیہ کر کے بعض کو رد اور بعض کو قبول کرتے ہیں۔ آپ معتقدات دین اور عبادات دینی کو قبول کرتے ہیں، مگر اس نظام زندگی کو ترک کردیتے ہیں جس کی عمارت انہی عبادات کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ اول تو یہ تجزیہ ہی اسلام کی رو سے غلط ہے اور کوئی مسلمان جو حقیقت میں اسلام پر ایمان رکھتا ہو اس کا ارادہ نہیں کرسکتا، کیونکہ یہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کا مصداق ہے۔ پھر اگر آپ نے یہ تجزیہ کر کے دائرۂ اسلام میں رہنے کا عزم کیا بھی تو آپ اس دائرے میں زیادہ مدت تک نہ رہ سکیں گے کیونکہ نظام زندگی سے بے تعلق ہونے کے بعد معتقدات دین اور عبادات دینی سب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ ان کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ غیر اسلامی اصول حیات پر ایمان لانے کے بعد اس قرآن پر ایمان قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ جو قدم قدم پر ان اصول حیات کی تکذیب کرتا ہے۔

بخلاف اس کے اگر آپ اس اسکیم کے مطابق اپنی سیاسی و معاشی زندگی کے معاملات کو منظم کرنا چاہتے ہیں جو اسلام نے تجویز کی ہے تو آپ کو الگ الگ پارٹیوں میں منقسم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، ایک ہی

پارٹی ـــــ حزب اللہ ـــــ ان سب کاموں کے لئے کافی ہے، کیونکہ یہاں سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کاشتکار، راعی اور رعیت کے مفاد میں تنازع نہیں ہے، بلکہ ان کے درمیان موافقت اور اشتراکِ عمل پیدا کرنے والے اصول موجود ہیں، کیوں نہ آپ ان اصولوں کے مطابق اپنی قوم کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کریں؟ جن کے پاس یہ اصول موجود نہیں ہیں، وہ اگر مجبوراً تنازع طبقات (Class War) کی آگ میں کودتے ہیں، تو آپ کیوں ان کے پیچھے جائیں؟

اسی طرح اگر آپ مادی ترقی چاہتے ہیں، علو اور تمکن فی الارض چاہتے ہیں، تو اسلام خود اس باب میں آپ کی مدد کرتا ہے۔ مگر وہ چاہتا ہے کہ آپ فرعونی و نمرودی علو اور ابراہیمی و موسوی علو میں امتیاز کریں۔ ایک تمکن وہ ہے جو جاپان اور انگلستان کو حاصل ہے۔ دوسرا وہ تھا جو صحابۂ کرام اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے حاصل کیا تھا۔ تمکن دونوں ہیں، اور دونوں تسخیرِ عناصر، استعمالِ اسباب اور قوانینِ طبعی کے علم اور ان سے استفادہ کرنے ہی کے نتائج ہیں، مگر زمین و آسمان کا فرق ہے دونوں گروہوں کے مقاصد اور نقطۂ نظر میں۔ آپ نتائج کے ظاہری اور نہایت سطحی تماثل کو دیکھتے ہیں، مگر ان کے درمیان جو روحی و اخلاقی بُعد ـــــ بُعد المشرقین ـــــ ہے اس کو نہیں دیکھتے۔ دنیا پرستوں کی ترقی اور ان کا تمکن اس تسخیرِ عناصر اور استعمالِ اسباب کا نتیجہ ہے جس کی تہہ میں زندگی کا حیوانی نصب العین کام کر رہا ہے۔ بخلاف اس کے قرآن جس علو اور تمکن فی الارض کا وعدہ کرتا ہے، وہ بھی اگرچہ تسخیرِ عناصر اور استعمالِ اسباب سے ہی حاصل ہو سکتا ہے، مگر اس کی تہہ میں زندگی کا بلند ترین اخلاقی و روحانی نصب العین ہونا چاہیے، جس کا تحقق ہو نہیں سکتا جب تک کہ ایمان باللہ اور اعتقاد یوم آخر پوری طرح مستحکم نہ ہو، اور جب تک کہ زندگی کی ساری جدوجہد اس آہنی فریم کے اندر کسی ہوئی نہ ہو جس کی گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کو آپ پر فرض کیا گیا ہے ـــــ وہی ارکانِ اسلام جن کو آپ "مولوی کے غلط مذہب" کی ایجاد قرار دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے قومی حقوق کو سمجھنے اور ان کے تحفظ کے صحیح طریقے معلوم کرنے میں جو غلطی کی جا رہی ہے، اس کی تہہ میں بھی وہی جہل کارفرما ہے جس کے مظاہر آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ اجتماعی زندگی کی پوری اسکیم اگر غیر اسلامی بنیادوں پر مرتب ہو جائے، تو جس چیز کو آپ "مذہب" کہتے ہیں اور جسے "پرسنل لا" قرار دیتے

ہیں۔ اس کا اپنی اصل پر باقی رہ جانا۔ اور آپ کی زبان کا اپنے رسم الخط کے ساتھ محفوظ رہنا کچھ بھی مفید نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اس غیر اسلامی مجموعہ میں یہ بے جوڑ اسلامی اجزا کسی طرح کھپ نہ سکیں گے اور رفتہ رفتہ اپنی جگہ چھوڑتے چلے جائیں گے۔ پھر ان اجزا کی حفاظت جن نمایندوں کے ہاتھ میں آپ دیں گے وہ اگر محض اصطلاحی و قانونی مسلمان ہوں تو وہ ان کی حفاظت بس اتنی ہی کر سکیں گے جتنی کہ غیر مسلم کر سکتے ہیں۔ ایسے مسلمان اگر اسلامی اصولوں کے خلاف غیر مسلموں کی اکثریت سے بھی کوئی فیصلہ کریں تو وہ اسلامی جماعت کے لئے اتنا ہی نقصان دہ ہوگا جتنا غیر مسلموں کا کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

جاہلیت کا یہی تصور ہے جس کے تحت کانگریس نے اپنا بنیادی حقوق (Fundamental rights) والا ریزولیوشن مرتب کیا ہے، اور اسی تصور جاہلیت کے تحت اپنی بجنور والی تقریر میں پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا ہے کہ "کانگریس کسی مذہبی عقیدے اور مذہبی روایات میں قطعاً دخل نہیں دیتی۔ کانگریس کو مذہب میں مداخلت کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ وہ ایسا کریگی۔ کانگریس ہندوستان کے مذاہب کی آزادی، مذہبی لوگوں کی تہذیب کی آزادی، تمدن کی آزادی، اور زبان کی آزادی کی حامی ہے"[1] پھر جاہلیت کا یہی تصور ہے جس کے تحت مسلمانوں کا ایک گروہ اس قسم کے اعلانات کو کافی سمجھتا ہے۔ اور مسلمانوں کو مشورہ دیتا ہے کہ ایسے اعلانات پر وہ مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں۔ کانگریسی رہنما تو خیر غیر مسلم ہیں اور مذہب کے صرف اسی تصور سے واقف ہیں جو انھیں وراثت میں ملا ہے۔ مگر مسلمانوں کے سیاسی رہنما (جن کے ساتھ بد قسمتی سے مذہبی رہنما بھی شریک ہوتے جاتے ہیں) اس سلسلہ میں جس ناواقفیت کا ثبوت دے رہے ہیں وہ حد درجہ افسوس ناک ہے۔ یہ حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر مذہب یعنی معتقدات دین اور مذہبی اعمال میں مداخلت نہ ہو، اگر مسلمانوں کے "پرسنل لا" یعنی قوانین نکاح و طلاق و وراثت کو، جیسے کہ وہ برٹش گورنمنٹ کے ماتحت ہیں، بدستور محفوظ رہنے دیا جائے، اگر مسلمانوں کی قدیم رسوم و عادات کو جیسی کہ وہ اس وقت پائی جاتی ہیں، ایک اجل مسمی تک برائے تبرک آثار قدیمہ (Old relics) کی حیثیت سے زندہ رہنے دیا جائے۔ تو بس مسلمانوں کا قومی مسئلہ حل ہو گیا، اور اس کے بعد مسلمانوں کو

---

[1] جمعیت علماء ہند کے واحد ترجمان "الجمعیۃ" مورخہ ۲۲ شعبان ۱۳۵۶ھ میں یہ تقریر صدر کانگریس کا "اعلان حق" کے زیر عنوان شائع ہوئی ہے۔

اپنے قومی مستقبل کی طرف سے مطمئن ہو جانا چاہیے۔ اگرچہ آزادی اور تحفظ کے یہ اعلانات بھی سراسر منافقانہ ہیں، جیسا کہ میں اپنے ایک دوسرے سلسلۂ مضامین میں خود صدر کانگریس کی تحریروں سے اور کانگریس کے شعبۂ اسلامیات کے شائع کردہ مضامین سے ثابت کروں گا، تاہم اگر ان کو خلوص و نیک نیتی پر بھی محمول کیا جائے، تب بھی یہ سمجھنا انتہا درجہ کی کم فہمی پر دلالت کرتا ہے، کہ ان اعلانات سے ہمارا قومی مسئلہ حل ہو جاتا ہے، درحقیقت ایسی چیزوں پر اطمینانِ قلب ظاہر کر کے ہمارے سیاسی و مذہبی رہنماؤں نے یہ راز فاش کیا ہے، کہ وہ ابھی یہ سمجھے ہی نہیں کہ مسلمانوں کا اصل قومی مسئلہ ہے کیا۔

مسلمانوں کا اصل قومی مسئلہ

اگرچہ میں گذشتہ صفحات میں اس مسئلہ کی کافی تشریح کر چکا ہوں، لیکن یہاں ایک مرتبہ پھر کوشش کروں گا کہ اس کو نہایت واضح صورت میں پیش کروں، تاکہ زمانہ کا جادو جو جہلا اور علماء سب کے دماغوں پر مسلط ہوتا جا رہا ہے، کسی طرح اترے اور مسلمانوں کے اربابِ حل و عقد اپنی توجہات کو اس مسئلہ کے حل کی طرف منعطف کریں۔

اوپر میں بتا چکا ہوں کہ اسلام اس قسم کا کوئی مذہب نہیں ہے، جو دنیا کی زندگی سے الگ چند معتقدات اور چند مذہبی مراسم انسان کو دیتا ہو تاکہ وہ آخرت کی زندگی میں نجات کے لئے سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئیں۔ بلکہ وہ درحقیقت ایک جامع تہذیب و تمدن ہے جو دنیا کو مزرعۃ الآخرۃ (آخرت کی کھیتی) سمجھ کر، اور انسان کو زمین میں خلیفۂ الٰہی قرار دے کر زندگی کے جملہ معاملات کی تنظیم کرتا ہے، تاکہ انسان دنیا میں صحیح برتاؤ کرے، اور اس کے نتیجہ میں آخرت کی کامیابی سے ہمکنار ہو۔ اس غرض کے لئے اسلام نے مسلمانوں کو ایک مکمل ضابطۂ زندگی دیا ہے، جو دوسرے ضوابطِ زندگی، مثلاً کمیونزم، فاشزم، نیشنلزم اور میٹیریلزم وغیرہ سے بالکل مختلف صورت پر ان کے نظامِ اجتماعی کی تشکیل کرتا ہے، اور ان کو علوم و آداب میں، اخلاق و معاملات میں، عادات و اطوار میں، تمدن و معاشرت میں، معیشت و سیاست میں، غرض زندگی کے ہر شعبے میں بعض طریقوں کو ترک اور بعض کو اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اس ضابطہ کی اساس ایک خاص طریقۂ فکر اور ایک خاص مقصدِ حیات پر رکھی گئی ہے، جو دوسری قوموں اور تہذیبوں کے طریقِ فکر و مقصدِ حیات سے بالکل مختلف ہے، جس کی رو سے اشیاء کی قدریں (VALUES)

دوسروں کی پسند کی ہوئی قدروں سے بالکل مختلف طور پر معین ہوتی ہیں، اور جس کے لحاظ سے زندگی میں مسلمان اپنا راستہ دوسروں کے انتخاب کئے ہوئے راستوں سے الگ انتخاب کرتا ہے۔

ہر تہذیب کی طرح اس تہذیب کے بقا اور فروغ کا انحصار بھی دو چیزوں پر ہے۔

ایک یہ کہ مسلمانوں کا نظام تعلیم ایسا ہو، جو ان کے دل و دماغ میں اسلام کے طریق فکر اور مقصد حیات کو صحیح طور پر پیوست کرے، اور ان کو اس قابل بنائے کہ وہ مسلمان کی حیثیت سے دیکھیں، مسلمان کی حیثیت سے سوچیں، اور اسلام کے بتائے ہوئے معیار کے مطابق زندگی کے ہر دوراہے پر ایک راستے کا انتخاب کریں۔

دوسرے یہ کہ یہ نظام تہذیب اپنی صحیح صورت میں عملاً قائم ہو، اجتماعی زندگی میں اس کے اصول عملاً نافذ ہوں، اور ایک ایسا اسلامی ماحول بن جائے جس میں مسلمان خود بخود اسلامی اصولوں پر زندگی بسر کریں۔ اگرچہ ان کے بعض افراد کو علمی حیثیت سے ان اصولوں کا پورا شعور نہ ہو، اس غرض کے لئے مسلمانوں کے پاس سیاسی طاقت کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ کوئی سوسائٹی سیاسی طاقت کے بغیر اپنی مخصوص ہیئت کی حفاظت نہیں کرسکتی۔

انگریزی اقتدار کی غلامی میں ہم کو اصلی نقصان جو پہنچا ہے۔ وہ یہی ہے کہ اپنی تہذیب کو ایک زندہ تہذیب کی حیثیت سے باقی رکھنے کے لئے یہ دونوں ذرائع ہم سے چھن گئے۔ ایک طرف ہماری قوم پر ایک ایسا نظام تعلیم مسلط کردیا گیا ہے، جو وسیع پیمانہ پر ہمارے افراد کے طریق فکر کو بدل رہا ہے، نظریۂ زندگی اور مقصد حیات کو بدل رہا ہے، اور اس معیار کو بدل رہا ہے جس سے وہ اشیاء کی قدریں متعین کرتے ہیں دوسری طرف ایک غیر قوم کی سیاسی طاقت نے ہم پر ایک ایسا ماحول مسلط کردیا ہے جو ہمارے عوام اور خواص کی زندگی کو روز بروز اسلامی مناہج سے ہٹاتا چلا جاتا ہے۔ اس نے ہمارے قوانین حیات کو بڑی حد تک معطل کردیا ہے، اور ہم اس کی بدولت اس طاقت سے محروم ہوگئے ہیں جس سے ہم اپنی سوسائٹی کو اس مخصوص اسلامی ہیئت پر قائم و برقرار رکھ سکیں۔

پس ہمارا اصل قومی مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جو انقلاب درپیش ہے، اس میں ہم اس نقصان کی تلافی کرسکیں جو انگریزی اقتدار سے ہماری قومیت اور ہماری تہذیب کو پہنچا ہے، ہمیں اتنی طاقت حاصل

ہو کہ ہم اپنے نظام تعلیم کو خود اپنی ضروریات کے مطابق بنا سکیں، اور ہمیں حکومت میں اتنا اقتدار حاصل ہو کہ ہم اپنے تمدنی، معاشرتی اور معاشی مسائل کو خود اپنے اصولوں کے مطابق حل کر سکیں، اور اپنے اجتماعی نظام کو پھر سے اسلامی بنیادوں پر مرتب کریں۔ یہی وہ چیز ہے جس کی تشریح میں نے اپنے "نصب العین" والے مضمون میں کی ہے۔ ہم کسی ایسی آزادیِ وطن کو صحیح معنوں میں پورے وطن کی آزادی نہیں کہہ سکتے جس میں وطن کی ۱/۴ مسلمان آبادی کو یہ آزادی حاصل نہ ہو۔ نہ ہم کسی ایسی حکومت کو وطنی حکومت سمجھ سکتے ہیں جس میں وطن کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو یہ اقتدار حاصل نہ ہو، اور نہ ہمیں کسی ایسی جنگِ آزادی سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے جس کے ذریعہ سے ہم اپنے مشترک وطنی نصب العین (یعنی حریت و استقلالِ وطن) کے ساتھ ساتھ اپنے اس قومی نصب العین کو بھی حاصل نہ کر سکتے ہوں۔

"قوم پرستی" کی تحریک جس کے تحت اس وقت آزادیِ وطن کے نام پر جنگ کی جا رہی ہے، درحقیقت ہم کو اپنے اس قومی مقصد کی تحصیل میں مدد نہیں دیتی، بلکہ اس کے برعکس ان نقصانات کو حدِ کمال پر پہنچانا چاہتی ہے، جو ہم کو انگریزی اقتدار سے پہنچے ہیں۔ ڈیڑھ سو برس تک ایک غیر قوم کی غلامی میں رہنے کی وجہ سے ہماری قوم میں جہالت، افلاس، اخلاقی انحطاط، اجتماعی بدنظمی، تمدنی بے راہ روی اور تہذیبِ اسلامی سے انحراف کی جتنی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں، انھیں دور کرنے میں ہماری مدد کرنا تو درکنار، وہ تو الٹا ان سے الٹا فائدہ اٹھانا چاہتی ہے، اور ہماری اندرونی خرابیوں ہی کو اپنے لئے کامیابی کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ ایک طرف اس تحریک کے علمبردار اپنا پورا زور اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ جمہور مسلمین کے دلوں سے اسلامی قومیت کا تخیل ہی مٹ جائے، اور وہ اپنی قومیت کے رشتہ سے کٹ کر معاشی طبقوں میں منقسم ہو جائیں، اور آپس میں روٹیوں پر لڑنا شروع کر دیں۔ دوسری طرف ان لوگوں کے پاس تہذیب و تمدن اور تنظیمِ حیات کے متعلق خود اپنے نظریات موجود ہیں، جو اسلام کے اصولوں سے بالکل مختلف ہیں، اور وہ مسلمانوں کی اجتماعی مزاحمت سے بے خوف ہو کر یہ چاہتے ہیں کہ تمام ہندوستان کی اجتماعی زندگی کو انہی نظریات کے تحت مرتب کریں جس کی لپیٹ میں مسلمان بھی آجائیں۔ اس طرح یہ تحریک ہمارے قومی مقاصد کے بالکل خلاف واقع ہوئی ہے۔ اور اس کے ساتھ شریک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی قومیت اور اپنی تہذیب

کو نیست و نابود کرنے میں خود حصہ لیں۔ وہ اپنے پروپیگنڈا کی طاقت سے یہ خیال پھیلا رہے ہیں کہ جو لوگ ان کی اس تحریک سے اختلاف کرتے ہیں وہ انگریزی اقتدار کے حامی ہیں، ٹوڈی اور سامراج پرست ہیں۔ لیکن یہ ایک زبردست جعل و فریب ہے جس کو دن کی روشنی میں فروغ دیا جا رہا ہے۔ دراصل سب سے بڑا ٹوڈی اور سامراج پرست تو وہ ہے جو وطن کی نجات کے لئے ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جن سے وطن کی ⅓ آبادی کسی طرح اتفاق نہیں کر سکتی۔ اپنی اس حماقت سے وہ خود انگریزی اقتدار کے قیام و بقا میں مدد دیتا ہے۔ اور پھر اس حماقت کا الزام ان لوگوں پر رکھتا ہے جو نجاتِ وطن کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینے پر تیار ہیں۔ مگر اپنی قومیت اور اپنی قومی تہذیب کو فنا کر دینے پر فطرۃً تیار نہیں ہو سکتے۔

میں ایک مستقل سلسلہ مضامین اس موضوع پر لکھ رہا ہوں کہ یہ تحریکِ وطن پرستی کن طریقوں پر چلائی جا رہی ہے، اور مسلمانوں کے لئے مسلمان رہتے ہوئے اس کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنا کس درجہ مہلک ہے۔ (یہ سلسلہ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ دوم" کے نام سے شائع ہو چکا ہے)

شبہات اور جوابات

میں نے اپنے گذشتہ مضامین میں حتی الامکان ہر پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن باوجود اس کے ان مضامین کو دیکھ کر مختلف اصحاب نے متعدد شبہات کا اظہار کیا ہے جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی توضیح مقاصد میں بہت کچھ کسر رہ گئی ہے۔ ذیل میں چند اہم شبہات کو خود معترضین کے اپنے الفاظ میں نقل کرکے رفع کرنے کی کوشش کروں گا۔ امید ہے کہ میرے جوابات سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔

اعتراض آپ نے سیاسی کام کرنے کے اکثر ان طریقوں کو غلط اور مسلمانوں کے لئے مضر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، جن پر مسلمانوں کے مختلف گروہ آج کل عمل پیرا ہیں۔ لیکن نہایت طول طویل مباحث کے بعد اپنے مضمون "راہ عمل" میں خود جو طریق کار مسلمانوں کے لئے تجویز کیا ہے وہ بالکل ہی ناقابل عمل اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتا ہے۔ بجائے خود مقاصد بہت ارفع و اعلیٰ ہیں اور ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہئے۔ لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے اندازاً کتنی مدت درکار ہوگی۔ اگر یہ مقاصد ایسے ہیں کہ ان کے حاصل کرنے میں صدیاں لگ جائیں گی، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کی سیاسی جنگ اس وقت تک ملتوی رہے گی جب تک مسلمان ان مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو جائیں؟

جواب فاضل معترض ایک طرف یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی قومی طاقت کو مضبوط کرنے کے لئے جن تدابیر کو میں ضروری اور ناگزیر قرار دیتا ہوں، وہ بہت ارفع و اعلیٰ ہیں۔ اور ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہئے۔ دوسری طرف وہ خود اپنے اس مسلمہ کو محض اس بنیاد پر رد کر دیتے ہیں کہ یہ تدابیر بالکل ہی ناقابل عمل اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان کے حصول میں صدیاں بھی کم ہیں۔ اس سے مجھے شبہ

ہوتا ہے کہ غالباً انھوں نے نہ تو ان وجوہ کی اہمیت پر کافی غور فرمایا ہے جن کی بنا پر میں ان تدابیر کو ناگزیر قرار دے رہا ہوں، اور نہ اس سوال پر زیادہ فکر صرف کی ہے کہ ان تدابیر کو بکار لانے اور جلد از جلد نتیجہ خیز بنانے کی عملی صورتیں کیا ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو غالباً وہ نہ تو اس طرح سرسری طور پر میری رائے سے اتفاق فرماتے۔ اور نہ اس طرح سرسری نظر میں اسے ناقابلِ عمل سمجھ کر رد کر دیتے۔ چونکہ بحث کا اصلی اور اہم ترین نکتہ یہی ہے، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ صرف معترض صاحب ہی نہیں بلکہ تمام وہ لوگ جو ان کے ہم خیال ہیں۔ اس کے اصولی اور عملی پہلوؤں پر پوری قوتِ فکر صرف کریں۔

اس بحث کو اصولی طریق پر طے کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ میرے خیالات کا تجزیہ کیجئے اور ایک ایک جز کے متعلق واضح طور پر فیصلہ کیجئے کہ آپ کو اس سے اتفاق ہے یا نہیں۔

۱۔ میری نگاہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت اور دوسری ہندوستانی ہونے کی حیثیت۔ ان میں سے پہلی حیثیت دوسری حیثیت پر مقدم ہے۔ اس معنی میں کہ اگر بالفرض ان دونوں حیثیتوں میں مصالحت ممکن نہ ہو، اور ہمارے سامنے یہ سوال پیش ہو جائے کہ ہم کس حیثیت کو دوسری حیثیت پر قربان کرنے کے لئے تیار ہوں گے، تو ہمارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی مسلمان ہونے کی حیثیت کو برقرار رکھیں اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت کو اس پر قربان کر دیں۔

یہ پہلا اور بنیادی مسئلہ ہے، جس کے فیصلے پر دو بالکل مختلف اور متضاد مسلکوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا انحصار ہے۔ جو شخص معنی مذکور الصدر میں دوسری حیثیت کو پہلی حیثیت پر مقدم رکھتا ہے، اس کا راستہ میرے راستہ سے بالکل الگ ہے۔ میں اس کو مسلمان سمجھنے سے انکار کرتا ہوں۔ اس لئے ایک ایسے مسئلہ میں جو صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میری بحث صرف ان لوگوں سے ہے جو اس بنیادی امر میں مجھ سے متفق ہیں۔ (آگے چل کر میں لفظ مسلمان جہاں کہیں استعمال کروں گا۔ اس سے میری مراد اسی دوسرے گروہ سے ہوگی)۔

۲۔ مسلم ہندوستانیوں کی سیاسی پالیسی کا اصل الاصول میرے نزدیک یہ ہے کہ ان کی مسلم ہونے کی حیثیت اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت میں کامل توافق ہو۔ اس ملک کا سیاسی، معاشی اور تمدنی ارتقا

کوئی ایسی راہ اختیار نہ کرنے پائے جس میں ہماری ان دونوں حیثیتوں کا ساتھ ساتھ نبھنا مشکل ہو جائے۔ ——— میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کسی مسلمان کو اختلاف ہوگا۔ تاہم اگر کسی کو اختلاف ہو تو وہ اپنے اختلاف کے وجوہ بیان کرے۔

۳۔ مذکورہ بالا پالیسی کو موثر اور کامیاب بنانا صرف ہمارے عمل اور ہماری قوت پر منحصر ہے۔ ہمارے غیر مسلم ہم وطن اور غیر مسلم حکمران اگر ہر قسم کے تعصب سے خالی ہوں اور انتہا درجہ کی نیک نیتی کے ساتھ کام کریں، تب بھی وہ اس توازن و توافق کو قائم نہیں کر سکتے جس کے قیام پر ہماری مذکورہ بالا دونوں حیثیتوں کے ساتھ ساتھ نبھنے کا انحصار ہے۔ اس لئے کہ وہ زندگی کا اسلامی نقطۂ نظر کہاں سے لائیں گے؟ اصول اسلام کا فہم انھیں کیسے نصیب ہوگا؟ تہذیب اسلامی کی اسپرٹ کو وہ کیونکر سمجھ سکیں گے؟ پس ہر قسم کے گروہی تعصبات سے قطع نظر کر لینے کے بعد بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامیت اور ہندوستانیت کے جس توازن و توافق پر مسلم ہندوستانی قوم کی زندگی کا مدار ہے۔ وہ اس قوم کی اپنی طاقت اور موثر طاقت کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ قائم رہ سکتا ہے۔ ——— کیا آپ اس کو تسلیم کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو وجوہ ارشاد ہوں اگر تسلیم ہے تو یہ فرمایئے کہ آیا یہ حقیقت آپ کی نگاہ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے یا اسے آپ ایسی چیز سمجھتے ہیں، کہ حاصل ہو تو بہت خوب۔ اور حاصل نہ ہو تو کچھ پروا نہیں۔ اس کے بغیر ہی آگے بڑھے چلو؟

۴۔ جس طاقت سے اس پالیسی کو موثر اور کامیاب بنایا جا سکتا ہے، میرے نزدیک وہ مسلمانوں میں موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس چند ایسی کمزوریاں جڑ پکڑ گئی ہیں جن کی وجہ سے وہ ہندوستان کے سیاسی ارتقاء کی رفتار پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ تمام دوسرے کاموں سے پہلے ہمیں ان کمزوریوں کو دور کرنا چاہئے۔ اور اپنے اندر کم سے کم اتنی طاقت پیدا کر لینی چاہئے کہ ہم اس ملک کے آیندہ نظام حکومت کی تشکیل میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا اثر استعمال کر سکیں۔ اس کے بغیر جنگ آزادی میں شریک ہونا اور نہ ہونا دونوں ہمارے لئے یکساں مہلک ہیں ——— آپ فرمائیں کہ اس بیان کے کس حصہ سے آپ کو اختلاف ہے؟ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں میں وہ کمزوریاں موجود نہیں ہیں جنھیں میں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے؟ یا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کمزوریوں سے وہ نتائج بد پیدا

نہیں ہو سکتے جن کا خطرہ میں نے ظاہر کیا ہے؟ یا آپ کی رائے یہ ہے کہ ہمیں حبِ وطن یا حبِ نفس کی خاطر ان خطرات کو گوارا کر لینا چاہیے؟ ان میں سے کونسی شق آپ اختیار فرماتے ہیں؟

۵۔ وہ طاقت جس کی ضرورت میں ثابت کر رہا ہوں میرے نزدیک، اُن تدابیر کے سوا کسی اور طریقہ سے حاصل نہیں ہو سکتی جنھیں اختصار کے ساتھ میں نے بیان کیا ہے۔ اگر آپ کو سرے سے اس کی ضرورت ہی تسلیم نہیں ہے، تب تو میرے نزدیک تدابیر کی بحث لاحاصل ہے۔ البتہ اگر آپ کو اس کی ضرورت کا اتنا ہی شدید احساس ہے جتنا کہ مجھ کو ہے، تو آپ ایک مرتبہ پھر ان کا جائزہ لیجئے۔ اور فرمایئے کہ ان کے سوا اور کون سی تدبیریں ہو سکتی ہیں جو ہماری کمزوریوں کو دور کر کے ہم کو مسلم ہونے کی حیثیت سے ایک طاقتور جماعت بنانے والی ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے جب آپ غور فرمائیں گے تو آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ یہ محض چند خوش آیند تجویزیں نہیں ہیں جن کی قدر افزائی کے لئے صرف تہی سفارش کافی ہو کہ ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے، بلکہ درحقیقت مسلمانوں کی قومی زندگی کا تحفظ انہی تدابیر پر منحصر ہے۔ اور اب اگر ہم خودکشی نہیں کرنا چاہتے، تو ہمیں بہرحال انہی کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

یہ تو تھی اصولی بحث۔ اب میں عملی پہلو کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ فاضل معترض نے غالباً یہ سمجھا ہے کہ میں بالکل ایک آیڈیل حالت کی طرف مسلمانوں کو لے جانا چاہتا ہوں، اور میرے نزدیک علم و عمل، اتحاد و اتفاق اور نظمِ اجتماعی کے آخری و انتہائی مرتبہ کا حصول سیاسی جنگ میں حصہ لینے سے پہلے ناگزیر ہے۔ اسی بنا پر انھوں نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ کام تو شاید صدیوں میں بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے گا۔ اگرچہ ایسی ایک آیڈیل حالت بھی اس سے پہلے ایک صدی کے چوتھائی حصہ میں ہندوستان کے موجودہ حالات سے بدرجہا زیادہ خراب، عرب جاہلیت کے حالات میں پیدا کی جا چکی ہے، لہٰذا اس کو ناممکن الوقوع کہنا درست نہیں۔ لیکن اگر اس کو ناممکن الوقوع تسلیم بھی کر لیا جائے، تو میں کہتا ہوں کہ جو کم سے کم طاقت اس وقت ہمیں درکار ہے اس کے لئے صدرِ اول کے سے مسلمانوں کی سی انتہائی دینداری اور اجتماعی تنظیم تک پہنچ جانا ضروری نہیں ہے۔ صرف اس قدر کافی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کے اصولوں پر ایک ایسی راسخ عام تیار کر دی جائے جو غیر مسلم تہذیب کے اثرات کو اپنی جماعت میں پھیلنے سے روک سکتی ہو جس کے سامنے

ایک قومی نصب العین واضح طور پر موجود ہو، جو اپنے نصب العین کے لئے اجتماعی جدوجہد کرسکتی ہو جس میں اتنا شعور ہو کہ گمراہ کرنے والے رہبروں کو پہچانے اور ان کا اتباع کرنے سے انکار کردے، اور جس میں اتنی طاقت ہو کہ منافقت اور غداری اس کے دائرے میں پھل پھول نہ سکے، یہ کام غیر ممکن ہے۔ نہ صدیوں کی مدت چاہتا ہے۔ اگر مسلمان یہ سمجھ لیں کہ اس کے بغیر ہندوستان میں ان کا بحیثیت ایک مسلم قوم کے زندہ رہنا مشکل ہے، اور اگر ان کے نوجوانوں میں سے ایک جماعت سچے جذبے کے ساتھ اس کام کے لئے جانفشانی اور پیہم عمل پر آمادہ ہو جائے تو ایک قلیل مدت ہی میں ایک ایسی رائے عام تیار کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہے جب کہ ہم سہولت پسندی چھوڑ دیں۔ صحیح طریق کار کی دشواریاں دیکھ کر ہمت ہار دینا اور دوسروں کے ہموار کئے ہوئے راستوں کو آسان دیکھ کر ان کی طرف دوڑ جانا، ایک ایسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جس کے ساتھ دنیا کی کوئی قوم بھی اپنی زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اگر خدانخواستہ یہی ذہنیت ہماری قوم پر غالب ہو گئی ہے اور ہم اس درجہ تنزل کو پہنچ چکے ہیں کہ اپنے قومی نصب العین کے لئے کوئی اجتماعی جدوجہد کرنا ہمیں غیر ممکن نظر آتا ہے تب تو ہمیں خود اپنی قبر پر فاتحہ پڑھ لینی چاہیے۔

اعتراض ا آزادی کی جنگ کا شروع کرنا یا نہ کرنا ہم مسلمانوں کی مرضی پر منحصر نہیں ہے کہ ہم جب چاہیں تب ہی جنگ شروع ہو، اور جب تک ہم نہ چاہیں وہ رکی رہے۔ سیاسی جنگ یا آزادی کی جنگ تو عرصہ ہوا کہ شروع ہو چکی اور برادران وطن بہت سے معرکے سر بھی کر چکے، اور نئے معرکے سر کرنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم مسلمان یہ کیسے کہہ سکتے ہیں، اور کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ "بھائیو، ذرا ٹھہر جاؤ ہمیں بھی تیار ہو لینے دو۔ پھر جنگ شروع کرنا۔" ہماری ایسی آواز کو کون سن سکتا ہے۔ اور اس پر ایک لمحہ کے لئے بھی کان دھر سکتا ہے؟

جواب یہ بات میں نے کبھی نہیں کہی کہ ہندوستان کی سیاسی جنگ اس وقت تک کے لئے ملتوی ہو جائے گی یا ہو جانی چاہیے جب تک مسلمان ان مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہو لیں۔ پچھلے واقعات اور موجودہ حالات پر نظر کرتے ہوئے اس بات کا تو خیال بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان کے سیاسی ارتقاء کی رفتار ہمارے شریک نہ ہونے سے رک جائے گی۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ منتشر اور

مختلف الخیال افراد کی شکل میں مسلمانوں کا شریک جنگ ہونا فائدہ سے زیادہ نقصان کے امکانات رکھتا ہے۔ اور یہ نقصان اس نقصان سے بہت زیادہ ہے جو کچھ مدت تک اس جنگ سے علیحدہ رہنے کی صورت میں پہنچے گا۔ لہذا مسلمانوں کو اپنی تمام تر توجہ اس طرف صرف کرنی چاہیے کہ کم سے کم مدت میں اپنے اندر وہ طاقت پیدا کرلیں جو شریک جنگ ہونے کے لئے ضروری ہے۔ اس دوران میں اگر دوسرے ان سے متعرض نہ ہوں تو انھیں بھی دوسروں سے متعرض نہ ہونا چاہیے۔

ہر شخص جسے خدا نے تھوڑی سی عقل بھی دی ہے خود سمجھ سکتا ہے کہ جہاں ایک طرف اکثریت ہو اور متحد و منظم ہو، اور دوسری طرف اقلیت ہو اور متفرق اور پراگندہ ہو، تو ان دونوں کے مقابلہ کا انجام کیا ہوگا؟ ہمارا حال اس وقت یہ ہے کہ ہمارے درمیان کوئی چیز بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ ایک گروہ کا نصب العین کچھ ہے اور دوسرے کا کچھ اور ——— ایک گروہ جن امور کو قومی مفاد سے متعلق سمجھتا ہے دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان کو قومی مفاد سے کوئی تعلق نہیں، اور تیسرا گروہ "قومی مفاد" کا نام سن کر فرقہ پرستی "تو ڈیت" اور رجعت پسندی کے آوازے کسنے شروع کر دیتا ہے۔ ایک جماعت کسی مسئلے پر اسلامی حقوق کی حفاظت کے لئے جدوجہد کرتی ہے اور دوسری جماعت غیر مسلموں کی فوج میں شامل ہو کر سب سے اگلی صفوں میں اس کا مقابلہ کرتی نظر آتی ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک جماعت کونسلوں کے اجلاس یا کانگریس کے اجتماع سے نماز کے لئے اٹھتی ہے، اور اس سے دس گنی جماعت بیٹھی رہتی ہے، اور بیٹھنے ہی پر اکتفا نہیں کرتی۔ بلکہ اس کے بعض افراد غیر مسلموں سے تقرب حاصل کرنے کے لئے علانیہ نماز پڑھنے والوں کی مذہبی دیوانگی پر طنز کرتے ہیں۔ غور کیجئے کہ اس سے بڑھ کر اور کون سی چیز ہماری قوم کی اجتماعی طاقت کو نقصان پہنچانے والی، ہماری ہوا اکھاڑ دینے والی، اور ہندوستان کی سیاسی میزان میں ہم کو سبک کر دینے والی ہو سکتی ہے؟ اس بیماری کو ساتھ لئے ہوئے آپ جدھر بھی جائیں گے آپ کا کوئی وزن نہ ہوگا، اور آپ کسی ایسی چیز کی حفاظت نہ کرسکیں گے۔ جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے آپ کو عزیز ہو۔

مگر اس کا یہ مفہوم لینا درست نہیں کہ ہم جو سیاسی جنگ میں کانگریس کے ساتھ شرکت کرنے سے انکار کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم تعطل چاہتے ہیں۔ درحقیقت معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اپنی

قوم کی منتشر طاقتوں کو جمع کرنا خود ایک جنگ ہے۔ یہ جنگ اگر ہم شروع کر دیں تو اس کے دوران میں ایک طرف ہمارے زنگ خوردہ ہتھیاروں پر صیقل بھی ہوگا۔ اور دوسری طرف ہماری منتشر طاقت جتنی جتنی مجتمع ہوتی جائے گی، ملک کی سیاسی میزان میں ہمارا وزن بھی اتنا ہی بڑھتا چلا جائے گا۔ بخلاف اس کے اگر ہم نے یہ دیکھ کر کہ فلاں جماعت نے اتنے معرکے سر کر لئے ہیں، اور فلاں گروہ اتنا طاقتور ہو چکا ہے، مرعوبانہ ذہنیت کے ساتھ کوئی طریق کار اختیار کیا تو یہ مسلمانوں کی زندگی کا ثبوت نہ ہوگا۔ بلکہ ان کی شکست خوردہ ذہنیت کا ہوگا۔

اعتراض آپ نے اپنے مضمون "آنے والا انقلاب اور مسلمان" میں جدید تعلیم و تہذیب سے متاثر ہونے والے مسلمانوں پر بہت سخت تنقید کی ہے اور غالباً آپ کا مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کی طرف سے سیاسی جنگ میں حصہ لینے کے اہل نہیں ہیں۔ میرے نزدیک یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ ہم اپنے میں سے کسی گروہ کو اس سیاسی جنگ سے خارج کرنے کی کوشش کریں۔ نہ اس کا موقع ہے کہ پرانے تعلیم یافتہ لوگ نئے تعلیم یافتہ طبقہ کو اس سیاسی جنگ سے یہ کہہ کر خارج کر دیں کہ تم اس کے اہل نہیں ہو، اور نہ اس کا موقع ہے کہ جدید تعلیم یافتہ لوگ پرانے تعلیم یافتہ بزرگوں کو اس مدافعانہ جنگ سے خارج کرنے کی کوشش کریں۔ بلکہ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس وقت سب مسلمان متفق، متحد، یک دل اور یک زبان ہو کر اس مدافعانہ جنگ میں حصہ لیں۔ اور کَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ کا مصداق بن کر دنیا پر ثابت کر دیں کہ مسلمان ابھی زندہ ہیں، اور زندہ رہیں گے، اور دنیا کی کوئی طاقت، کوئی قوت، کوئی تدبیر اس نور الٰہی کو بجھا نہیں سکتی، جس کے مسلمان حامل ہیں۔

جواب یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو بنیان مرصوص بننے کی ضرورت ہے لیکن معترض کو میرے کن الفاظ سے یہ غلط فہمی ہوئی کہ میں مسلمانوں کو بنیان مرصوص دیکھنا نہیں چاہتا بلکہ ان کے درمیان پارٹیوں کا اختلاف پیدا کرنا چاہتا ہوں؟ حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کو ایک ٹھوس جماعت صرف اسی طرح بنایا جا سکتا ہے، کہ اس کے افراد ایک نصب العین پر متفق ہوں۔ اور جسم واحد بن کر اس کے لئے ایک

طریق کار اختیار کریں۔ اس غرض کے لئے ہم کو نصب العین اور طریق کار، دونوں کی توضیح کرنی پڑے گی اور جس طرح ہمارا یہ فرض ہوگا کہ قوم کے ان تمام افراد کو اپنے ساتھ ملالیں جو اس نصب العین اور اس طریق کار سے متفق ہوں، اسی طرح ہمارے لئے یہ بھی ناگزیر ہوگا کہ ان افراد کے ساتھ غلظت و شدت برتیں جو اپنی خود غرضی یا منافقت کی بنا پر جماعت کا ساتھ دینے سے انکار کریں، عام اس سے کہ وہ نئے تعلیم یافتہ ہوں یا پرانے تعلیم یافتہ ——— یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ مختلف مقاصد کے تحت مختلف اور متضاد راستوں کی طرف جانے والے افراد کو کسی طرح ایک بنیان مرصوص نہیں بنایا جا سکتا۔

اعتراض: آپ نے بلا ضرورت جو ضمنی بحثیں چھیڑی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک گذشتہ ستر سال میں مغربی تعلیم سے مسلمانوں کو نقصان ہی نقصان پہنچا ہے اور مختصر یہ کہ وہ مسلمان نہیں رہے۔ یہ تسلیم ہے کہ ہم میں کچھ نہ کچھ خرابیاں بھی پیدا ہوئیں مگر یہ تسلیم نہیں ہے کہ ہماری موجودہ حالت اب سے ڈیڑھ صدی پہلے کی حالت سے زبوں تر ہے اور ہماری اخلاقی خرابیاں اور کمزوریاں پہلے سے زیادہ ہو گئی ہیں۔ اگر کسی قوم کا سیاسی زوال اور محکومیت اس میں اخلاقی خرابیاں پیدا کرنے کو مستلزم ہے تو ہندوؤں کو تو محکومیت کی حالت میں رہتے ہوئے ایک ہزار برس ہو گئے، مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کی موجودہ اخلاقی تعلیمی اور اقتصادی حالت بمقابلہ ہزار برس پہلے کے بہت بہتر ہے۔

جواب: مسلمانوں کی حالت کو ہندوؤں پر قیاس کرنا میرے نزدیک قیاس مع الفارق ہے۔ ہندو قوم میں وحدت ملی کا کوئی تصور نہ تھا، ان کا سوشل سسٹم ان کو متفرق کرنے والا تھا نہ کہ مجتمع، ان کے اندر ایسی رسمیں رائج تھیں جو گھن کی طرح ان کی قوم کو کھائے جا رہی تھیں، وہ دنیا کی دوسری قوموں سے بالکل الگ تھلگ ہندوستان میں پڑے ہوئے تھے، اور اسی کو دنیا سمجھتے تھے۔ اس حالت میں جب وہ مسلمانوں کے اور پھر انگریزوں کے زیر حکومت آئے تو اگرچہ غلامی کے ناگزیر نتائج سے محفوظ نہ رہ سکے لیکن بحیثیت مجموعی ان کو نقصان سے بہت زیادہ فوائد حاصل ہوئے۔ ان میں وحدت قومی کا ایک تصور پیدا ہو گیا، ان کو اپنے سوشل سسٹم کی بہت سی خرابیوں کا احساس ہوا جس کی بدولت متعدد اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں۔ اور باہر سے علم و تہذیب کی جو روشنی ان تک پہنچی اس نے ان کے خیالات کی دنیا کو بہت

کچھ بدل دیا۔ علاوہ بریں اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ "ہندویت" کی اساس کسی عقیدے اور کسی اجتماعی عمل اور کسی نظامِ تہذیب پر قائم نہیں ہے۔ بلکہ نسل اور مرز بوم کی وحدت پر مبنی ہے، اس لئے بیرونی اثرات سے ان کے قدیم عقائد اور طرزِ معاشرت اور افکار و اعمال میں خواہ کتنا ہی تغیر ہو جائے ان کی "ہندویت" بہر حال برقرار رہتی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ان کے اپنے مذہب و تمدن میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ایک ترقی پذیر قومیت کو وجود میں لا سکے۔ لہذا مغربی عمرانی و سیاسی تصورات ان کے لئے بجائے مضر ہونے کے درحقیقت مفید ہیں، کیونکہ یہی چیز ان کے اندر زندگی اور حرکت پیدا کر سکتی ہے اور اسی سے ان میں قومیت کا نشو و نما ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ قوم اپنی ایک وحدت اور نہایت طاقت ور وحدت رکھتی تھی، اس کا سوشل سسٹم غایت درجہ صحیح و سالم تھا، جاہلانہ رسوم سے یہ بالکل پاک تھی، اس میں ایک اعلیٰ درجہ کی حضارت موجود تھی، اور یہ سب کچھ اسے صرف ایک چیز کی بدولت حاصل ہوا تھا جس کا نام "اسلام" ہے۔ ہندوستان میں دوسری قوموں کے ساتھ جب یہ قوم خلط ملط ہوئی، تو اس کی بلندی تو دوسروں کو پستی سے اٹھانے کی موجب ہوئی مگر دوسروں کی پستی نے خود اس کو بلندی سے گرانا شروع کر دیا۔ اس نے دوسروں سے نسلی و وطنی عصبیت لی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی وحدت پارہ پارہ ہونے لگی۔ اس نے دوسروں سے جاہلیت کی رسوم لیں نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی قومی طاقت کو گھن لگ گیا۔ اس نے اپنے سوشل سسٹم میں دوسروں کے طریقے داخل کر لئے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ توازن اور اعتدال بگڑتا چلا گیا۔ جو اس سسٹم کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس نے دوسروں کے عقائد و افکار کو بغیر سوچے سمجھے قبول کرنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اپنے مذہب سے دور ہٹتی چلی گئی، حالانکہ مذہب ہی اس کی قومیت اور اس کے اخلاق، تہذیب اور تمدن کا قوام تھا۔ یہی چیز آخر کار اس قوم کے سیاسی زوال کی باعث ہوئی، اور اس نے حکومت کے مقام سے گرا کر اسے غلامی کی لعنت میں مبتلا کر دیا۔ غلامی کے دور میں جو مزید خرابیاں اس قوم میں پیدا ہوئیں، ان کو میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ اگر آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں گے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مغربی استیلا سے مسلمانوں پر جو اثرات مترتب ہوئے وہ ان اثرات کے بالکل برعکس ہیں جو ہندوؤں پر

مترتب ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کو اس نے پستی سے اٹھایا اور مسلمانوں کو اور زیادہ پستی میں گرادیا۔ اس نے ہمارے اخلاق، عقائد، تہذیب و تمدن، اور نظام معیشت و معاشرت کو جو نقصان پہنچایا ہے وہ ان جزوی فوائد کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ ہے، جو مغربی تعلیم و تہذیب سے ہمیں حاصل ہوئے ہیں۔

مسلمانوں پر مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کے اثرات کا ذکر میرے مضامین میں محض ایک ضمنی بحث کی حیثیت سے نہیں آیا ہے۔ بلکہ میں قومی امراض کی تشخیص اور ان کی شدت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ منجملہ دوسرے اسبابِ زوال کے ان اثرات کا بھی پوری طرح جائزہ لیا جائے۔

اعتراض نئی تعلیم اور پرانی تعلیم کی بحث دراصل دور از کار ہے۔ نئے تعلیم یافتہ ہوں یا پرانے، وہ سب مل کر مسلمانوں کی کل آبادی کے مقابلہ میں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ ہمارے سیاسی مستقبل کا دارومدار زیادہ تر کاشتکاروں اور مزدوروں کے اس بے زبان طبقے پر ہے جس نے نہ تو پرانی تعلیم حاصل کی ہے اور نہ نئی۔ یہ لوگ مسلمانوں کی آبادی کا ۹۰ حصہ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔ اس لئے ہم سب کا خواہ پرانے تعلیم یافتہ ہوں یا نئے، یہ فرض ہے کہ اس طبقہ کی اصلاح کریں، اس میں اپنے حقوق سمجھنے کا مادہ پیدا کریں۔ اور ان میں اس قسم کی استعداد پیدا کریں۔ کہ وہ اپنے حقِ رائے دہندگی کو مسلمانوں کے مفاد کے لئے استعمال کرسکیں۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہوگئے تو سمجھ لیجئے کہ ہم نے سیاسی جنگ جیت لی۔

جواب درحقیقت یہی کام تو ہمارے پیش نظر ہے۔ ہم کو سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ ہمارے عوام جن کو اسلام کی تعلیمات سے کسی قسم کی واقفیت نہیں ہے، جو افلاس اور فاقہ کشی میں مبتلا ہیں، جن کو اسلامی تہذیب و تمدن کی گرفت میں رکھنے کے لئے کوئی نظام موجود نہیں ہے، جن میں جاہلیت کی رسوم پھیلی ہوئی ہیں، اور جو اسلامی تعلیم و تمدن کے اثر سے دور رہنے کی بدولت ہندوستان کی آبادی کے سوادِ اعظم سے ہم رنگ ہوگئے ہیں، کہیں اشتراکیت اور نزاعِ طبقات کی اس تبلیغ کا شکار نہ ہوجائیں، جو اس وقت "قوم پرست" جماعت کی طرف سے کی جارہی ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ ان مسلمانوں کے پست طبقات کو یہ تحریک اسلام کا علم اور شعور رکھنے والے طبقات سے جدا کردے گی، معاشی کشمکش برپا کرکے ان کے درمیان عداوت ڈال

دے گی، اور جب یہ طبقے اپنی قوم کے اہل دماغ گروہ کی رہنمائی سے محروم ہو جائیں گے۔ تو ان کی جہالت اور ان کے افلاس سے فائدہ اٹھا کر انھیں اقتصادی مساوات کا سبز باغ دکھایا جائے گا، اور اس بہانے سے ان کو غیر مسلم عوام میں جذب کر لیا جائے گا۔ یہ اندیشہ اس وجہ سے اور زیادہ بڑھ گیا ہے کہ اب تک قوم پرست تحریک کے مبلغین اور مسلم عوام کے درمیان جو دیوار حائل تھی جس کی وجہ سے مسلم عوام ان کی تبلیغ کو سننے تک کے روادار نہ تھے، اسے ہمارے علمائے کرام اپنی ناعاقبت اندیشی سے منہدم کر رہے ہیں۔ ان کے اس فعل کا نتیجہ یہ ہوتا نظر آتا ہے کہ مسلم عوام آہستہ آہستہ ان لوگوں کی باتیں کان دھر کے سننے لگیں گے، اور چونکہ یہ لوگ علانیہ تبدیلِ مذہب کی تلقین نہیں کرتے، بلکہ ان اشتراکی خیالات کی تبلیغ کرتے ہیں جو مفلس طبقوں کے دل و دماغ پر بڑی آسانی کے ساتھ چھا جاتے ہیں، اس لئے ہمارے عوام رفتہ رفتہ ان کے جال میں پھنستے چلے جائیں گے اور آخر کار یہ چیز امت مسلمہ کو پارہ پارہ کر دے گی اور جمہور مسلمین کو غیر مسلم سوادِ اعظم میں مدغم کر دینے کی موجب ہو گی۔ علمائے کرام آج جس چیز کو سمجھانے سے بھی نہیں سمجھ رہے ہیں۔ کل وہ چیز حقیقت بن کر ان کے سامنے آئے گی اور ایسی حالت میں آئے گی کہ اس کا علاج ان کی قدرت سے باہر ہو گا۔ اس وقت ان حضرات کی آنکھیں کھلیں گی، اور انھیں معلوم ہو گا کہ جو تیر انھوں نے اندھیرے میں چلایا تھا، وہ انگریزی سامراج کے بجائے محمد رسول اللہ کی امت کے سینے میں پیوست ہوا ہے۔

ان خطرات کا سدباب اگر کسی صورت سے ہو سکتا ہے۔ تو وہ صرف یہی ہے کہ مسلمانوں میں ایک فعال جماعت ایسی اٹھ کھڑی ہو جو جمہور قوم میں جا کر ایک طرف تو ان کے اندر اسلام کی جوہری تعلیم پھیلائے رسوم جاہلیت کو مٹائے، ان کو اسلامی تہذیب و تمدن کے اصولوں سے باخبر کرے اور دوسری طرف ان کی روٹی کے مسئلہ کو اسلامی اصولوں کے مطابق حل کرے۔ ہم اشتراکی تحریک کی جو مخالفت کرتے ہیں اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم ظالمانہ سرمایہ داری اور ناجائز اغراض رکھنے والے طبقوں کے حامی ہیں۔ بلکہ دراصل اسلام کے متبع ہونے کی حیثیت سے ظالمانہ سرمایہ داری کو مٹانے اور مفلس طبقوں کی مصیبتوں کو حل کرنے کے لئے ہم خود اپنے اصول رکھتے ہیں، اور وہ اشتراکیت کے اصولوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ہم اپنی قوم کے معاشی مسائل کو خود اپنے ہی اصولوں کے مطابق حل کرنا چاہتے ہیں، اور یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ اشتراکیت کے

کے علمبردار ہمارے جمہور پر قابض ہو کر اپنے طریقوں سے امت مسلمہ کو پارہ پارہ کر دیں۔ ہمارے سامنے اس وقت صرف معاشی اور سیاسی سوال ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر اپنی تہذیب کی حفاظت کا بھی سوال ہے، اس لئے ہم کو اپنے جمہور کی تنظیم کرنے میں اسلامی اصول اختیار کرنے چاہئیں۔ ہمارے لئے گاندھی اور جواہر لال کا اسوہ قابلِ اتباع نہیں، بلکہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے جس کی پیروی ہم کو کرنی چاہئے۔ خدا پرستوں کی تنظیم کے جو اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے استعمال کئے گئے تھے، وہ صرف اسی زمانہ کے لئے نہ تھے، بلکہ تمام ازمنہ و امکنہ کے لئے تھے۔ ان کو عمل میں لانے کے طریقے اور وسائل زمانی و مکانی حالات کے لحاظ سے بدل سکتے ہیں، مگر وہ اصول بجائے خود اٹل ہیں۔ اور آپ جس ملک اور جس زمانہ میں بھی خدا پرست، قوم کی تنظیم کرنا چاہیں گے آپ کو انہی اصولوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ باطل کا اقتدار جب پوری طرح چھایا ہوا ہوتا ہے، اس وقت لوگوں کو شبہ ہونے لگتا ہے۔ کہ ان اصولوں پر عمل درآمد غیر ممکن الوقوع ہے یا اگر ممکن بھی ہے تو اس کے لئے صدیاں درکار ہیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ غیر ممکن چیز ہر وقت ممکن ہو سکتی ہے، اور دیکھتے دیکھتے ہوا کا رخ بدل سکتی ہے۔ البتہ اس کے لئے ایک کڑی شرط یہ ہے کہ اس مشین کو صرف وہی اخلاقی طاقت حرکت میں لا سکتی ہے جو سیرتِ محمدی کے سرچشمہ سے ماخوذ ہو۔ جن لوگوں میں باطل سے مرعوب ہو جانے اور ہر بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے سر جھکا دینے کی کمزوری موجود ہو، اور جو لوگ اتنی استقامت نہ رکھتے ہوں کہ سخت سے سخت طوفان میں بھی راہِ راست پر جمے رہ سکیں۔ ان کے ہاتھوں سے یہ مشین کبھی حرکت نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کے لئے تنظیم کے کسی نئے پروگرام کی ضرورت نہیں، پروگرام تو بنا بنایا موجود ہے، کمی صرف ایک ایسے رہنما اور چند ایسے کارکنوں کی ہے۔ جو اپنے مقصد میں اپنے نفس اور ہوائے نفس کو فنا کر سکے ہوں، جن کے دل نام و نمود کی بھوک، ذاتی وجاہت کی پیاس، مال و زر کی حرص، اور نفاق و حسد کی آگ سے پاک ہوں، جن میں حق کو بلند کرنے کا ایسا ارادہ موجود ہو جو کسی حالت میں ٹل نہ سکتا ہو۔ اور جن میں اتنی صلاحیت ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے طریقہ پر نظم کے ساتھ کام کر سکیں۔

اعتراض آپ اسلامی حقوق کی حفاظت کے لئے آئینی ضمانتوں کو بے فائدہ قرار دیتے ہیں اس بنا پر کہ جب تک ان ضمانتوں کی پشت پر کوئی Sanction نہ ہو، اکثریت ان کی پابندی کے لئے مجبور نہیں ہو سکتی۔ اس کے مقابلہ میں آپ چاہتے ہیں کہ مسلمان سلطنت کے اندر ایک سلطنت بنانے کی کوشش کریں۔ مگر بعینہ وہی اعتراض آپ کی اس تجویز پر بھی تو ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کے پاس وہ کونسی طاقت ہوگی جو اس "سلطنت در سلطنت" کے احکام کو اکثریت کی مرضی کے خلاف نافذ کر سکے گی؟ فرض کیجئے کہ اکثریت یہ قانون نافذ کرتی ہے کہ ہندوستان میں گائے کی قربانی ایک قلم موقوف ہو جائے۔ مسلمانوں کی یہ سلطنت در سلطنت اس کو کیسے روک سکے گی؟ فرض کیجئے کہ کوئی مسلمان مرتد ہو جائے۔ آپ اس کو رجم کی سزا کیسے دے سکیں گے؟ فرض کیجئے کہ آپ حد زنا جاری کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکر ممکن ہے کہ آپ مرتکبین زنا کے ساتھ غیر مسلم زانیوں یا زانیات پر بھی حد جاری کر سکیں؟

جواب "سلطنت در سلطنت" ایک مبہم اصطلاح ہے جس کا اطلاق ایک حکومت کے حدود اقتدار میں کسی دوسرے نظام کی قوت و اثر کے مختلف مدارج پر ہوتا ہے۔ اس قوت و اثر کے دائرے کا وسیع یا محدود ہونا دراصل منحصر ہے اس نظام کی مضبوطی اور اس کے حامیوں کی معنوی طاقت کے کم یا زیادہ ہونے پر۔ واقعات کی دنیا میں اقلیت و اکثریت کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ اصل چیز نظم اور اجتماعی ارادہ کی طاقت ہے۔ اسی طاقت سے قلیل التعداد انگریز اپنے سے ہزار گنی اکثریت پر حکمران ہے۔ ایک جمہوری نظام حکومت میں بھی "اقتدار اکثریت" (Majority rule) کے قاعدہ کو ایک منظم اور قوی الارادہ اقلیت بے اثر یا کم اثر بنا سکتی ہے۔ پس یہ سوال کہ وہ "سلطنت در سلطنت" جو میں تجویز کر رہا ہوں کن حدود تک وسیع ہوگی، اس حالت میں طے نہیں ہو سکتا جب کہ ہم سرے سے کوئی نظم اور کوئی اجتماعی ارادہ ہی نہیں رکھتے۔ پہلے ہم کو یہ طاقت فراہم کرنی چاہئے۔ پھر ہم جتنی طاقت فراہم کر لیں گے۔ اسی کی نسبت سے سلطنت در سلطنت کے حدود وسیع یا محدود ہوں گے۔

اعتراض آپ کہتے ہیں کہ اگر دارالاسلام قائم نہیں کر سکتے تو کم از کم شبہ دارالاسلام ہی قائم کر...

کی کوشش کریں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ جو نظام حکومت اس وقت قائم ہے، یا جو آئندہ آئینی ضمانتوں کے تحت قائم ہوگا وہ بھی تو شبہ دار الاسلام ہوگا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ موجودہ نظام حکومت دار الاسلام نہیں ہے۔ اور دار الحرب بھی نہیں ہے۔ لہٰذا ان دونوں کے بیچ میں جو صورت بھی ہوگی اس پر شبہ دار الاسلام ہی کا اطلاق ہونا چاہیے۔

جواب "شبہ دار الاسلام" سے میری مراد ایک ایسا نظام سیاست ہے۔ جو خالص "دار الکفر" کی بہ نسبت خالص "دار الاسلام" سے زیادہ اقرب ہو۔ ہندوستان کی موجودہ حالت یہ نہیں ہے۔ اس میں مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم کے کسی طرح کی بھی خود اختیاری حاصل نہیں۔ جو برائے نام مذہبی اور تمدنی آزادی ان کو دی گئی ہے۔ وہ غیر مسلم حکمرانوں کی عطا کردہ چیز ہے جس کے حدود کو کم یا زیادہ کرنا ان کے اپنے اختیار تمیزی پر موقوف ہے۔ ہمارے جن مذہبی احکام کو وہ اپنے اصول کے مطابق درست نہیں سمجھتے ان کے نفاذ کو روک دیتے ہیں۔ اور جو مذہبی احکام ان کی مصلحتوں کے خلاف ہیں ان کو بھی نافذ نہیں ہونے دیتے۔ اس کے بعد صرف وہ احکام رہ جاتے ہیں۔ جو ان کی نگاہ میں بے ضرر ہیں۔ ان کے نفاذ کی وہ ہمیں اجازت دے دیتے ہیں۔ لیکن اس آزادی کے دائرے میں بھی ہم ان کے اقتدار کے بلاواسطہ اثر سے محفوظ نہیں ہیں۔ انھوں نے تعلیم کا جو نظام قائم کیا ہے وہ ہمارے مذہب اور تہذیب کے اصولوں کا مخالف ہے اور اس کے اثر سے ہماری نوجوان نسلوں کا ایک بڑا حصہ ان مذہبی احکام سے بھی روگردانی کرنے لگتا ہے جن کی بجا آوری میں ہم آزاد چھوڑے گئے ہیں۔ انھوں نے جو نظام معیشت قائم کیا ہے اس کی گرفت میں ہم اس قدر بے بس ہو چکے ہیں کہ ہمارے لئے اسلامی اصول معیشت کی پابندی تقریباً قریب محال ہو گئی ہے۔ اگرچہ ظاہر میں کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو ہم کو اپنے اصولوں کی پابندی سے روکتا ہو۔ اسی طرح ان کا نظام عدل و قانون اور ان کا آئین حکومت ایسا ہے جو ہمارے اخلاق ہماشرت تمدن ہر چیز پر بلاواسطہ اثر ڈالتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں ہم اس درجہ بے اختیار ہیں کہ اپنی حفاظت کے لئے کوئی کارگر تدبیر عمل میں نہیں لا سکتے۔ ان سب پر مزید یہ کہ غیر مسلم طاقت کا اقتدار مطلق فی نفسہٖ ایک زبردست اثر رکھتا ہے جو طاقت کم از کم ظاہر کے اعتبار سے رزق کے خزانوں کی مالک اور

عزت و ذلت بخشنے کی مختار نظر آتی ہو، محکوم قوم اس سے تقرب حاصل کرنے کے لئے اپنی وہ بہت سی چیزیں بھی اس کے قدموں میں لاکر ڈال دیتی ہے جنھیں وہ اس سے بجبر نہیں مانگتی۔ ایسی حالت جس ملک کی ہو، وہ اگر خالص دار الکفر نہیں تو اس سے اقرب ضرور ہے۔ اس لئے اسے شبہ دار الکفر کہنا چاہئے نہ کہ شبہ دار الاسلام۔

میں جس چیز کی طرف مسلمانوں کے سیاسی فکر رکھنے والے لوگوں کو توجہ دلا رہا ہوں وہ یہی ہے کہ انھیں اس حالت کو بدلنے کے لئے اپنی قوتوں کو مجتمع کرنا چاہئے۔ اگر اس کو بدلنا ہے تو اس کی تیاری کا یہی وقت ہے۔ انقلابی دور میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کا عمل جاری ہوتا ہے۔ اس وقت ہم نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ آنے والی حالت کی شکل معین کرنے میں اپنا اختیار استعمال کرسکتے ہیں۔ جب وہ ایک خاص صورت میں ڈھل جائے گی اور پوری طرح مستحکم ہو جائے گی اس وقت ہمارے لئے اختیار استعمال کرنے کا شاید کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ گذشتہ صدی کے ابتدائی دور میں ہم نے غفلت کی اور اس شبہ دار الکفر کو نہ صرف قائم ہو جانے دیا، بلکہ اپنے ہاتھوں سے اس کے قائم ہونے میں مدد دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بالکل بے بس ہوکر اس کی گرفت میں جکڑے گئے، اور آج ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ ہمارے لئے اس کی بندشوں میں سے کسی چھوٹی سے چھوٹی بندش کو توڑنا بھی کس قدر مشکل ہے۔ اسی سے سبق حاصل کرنا چاہئے کہ اگر ہم نے ہندوستان کے سیاسی انقلاب کو موجودہ رفتار پر جانے دیا، اور کوئی ایسی منظم طاقت فراہم نہ کی جس سے ہم اس کی سمت متعین کرنے میں خود اپنا اختیار بھی استعمال کرسکیں، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس شبہ دار الکفر کی جگہ ایک دوسرا شبہ دار الکفر لے لے گا، اور اس کے مستحکم ہو جانے کے بعد ہم اس کی گرفت میں بھی اتنے ہی بے بس ہوں گے جتنے اس وقت ہیں۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس کو سمجھنے کے لئے کسی گہرے تفکر کی ضرورت نہیں، محض عقلِ عام (Commonsense) رکھنے والا ایک عامی بھی اس کو سمجھ سکتا ہے، مگر یہ نامساعد حالات کی طاقت کا کرشمہ ہے کہ ایسی واضح بات کو سمجھانے کے لئے بھی دلائل کی ضرورت پیش آرہی ہے۔ اور دلائل کے زور سے بھی اس کو دلوں میں اتارنا مشکل ہو رہا ہے۔ جو لوگ پہلے ہندوستانی اور پھر سب کچھ ہیں وہ اگر اسے ماننے سے

انکار کریں تو جائے تعجب نہیں، اس لئے کہ ان کی نگاہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی کا سوال کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔ ان کا ضمیر تو پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہے کہ شبہ دار الکفر ہو یا خالص دار الکفر ہمیں صرف آزاد ہندوستان چاہئے جس میں ہمارے رزق کے خزانے خود ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔ لیکن جو لوگ پہلے مسلمان اور پھر سب کچھ ہیں ان پر مجھے سخت حیرت ہے کہ وہ اس کو سمجھنے سے کیوں انکار کرتے ہیں۔

اعتراض آئینی ضمانتوں پر تو بہر حال برطانوی حکومت اور ہندوستان کی اکثریت کو راضی کیا جا سکتا ہے اور یہ ایک قابل عمل چیز نظر آتی ہے، لیکن "سلطنت در سلطنت" کا تخیل تو ہے ہی ایسا جس پر نہ برطانوی حکومت راضی ہو سکتی ہے، اور نہ ہندوستان کی اکثریت۔ یہ نام درمیان میں آجانے کے بعد تو مصالحت کا دروازہ ہی بند ہو جاتا ہے۔

جواب اس سے پہلے میں جو کچھ بیان کر چکا ہوں اس کو غور سے پڑھنے کے بعد مجھے امید ہے کہ معترض صاحب اپنی اس رائے پر نظر ثانی کریں گے۔ آئینی ضمانتیں، اور ان پر اکثریت کی رضامندی ایسی چیز نہیں ہے جس کے بل پر کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہو۔ اگر ان ضمانتوں کی پشت پر ہماری اپنی طاقت نہ ہو تو ان کا قائم رہنا یا نہ رہنا بہر حال اکثریت کی رضامندی پر موقوف ہوگا، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کے آئندہ نظام سیاست میں اکثریت کے اقتدار کی وہی حیثیت ہو جو اس وقت انگریزی اقتدار کی ہے اور اس کے دست قدرت میں ہم ویسے ہی بے بس ہوں۔ جیسے اب ہیں۔

اکثریت کے منظور کرنے یا نہ کرنے پر جس سلطنت در سلطنت کا مدار ہو۔ وہ اس نام سے موسوم کئے جانے کے قابل ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو وہ چیز ہے جس کو ایک جماعت کا طاقتور اجتماعی ارادہ قائم کرتا اور قائم رکھتا ہے، خواہ کوئی اس پر راضی ہو یا نہ ہو۔

اعتراض یہ سلطنت در سلطنت کا تخیل ہندوستان کی سیاسی ترقی کیلئے بھی تو مفید نہیں ہے۔ اگر اسی طرح ہندوستان کی ہر قوم سلطنت کے اندر ایک سلطنت بنانے کے لئے اٹھ کھڑی ہو تو نتی الواقع

ہندوستان میں کوئی سلطنت قائم ہی نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کی جگہ فرقہ وارانہ انار کی لے لے گی۔

جواب میں نصب العین والے مضمون میں ان کم سے کم حقوق اور اختیارات کی توضیح کر چکا ہوں جو ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ سلطنت در سلطنت سے میری مراد مسلمانوں کا ایک ایسا اجتماعی نظام ہے، جو انہی حقوق اور اختیارات کو استعمال کرے اور جس میں اتنی طاقت ہو کہ اگر کوئی ان حقوق اور اختیارات میں کمی کرنا چاہے بھی تو نہ کر سکے۔ اب اس مضمون کو غور سے دیکھئے اس میں جن حقوق اور اختیارات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں کونسی چیز ایسی ہے جو مشترکہ ہندوستانی مفاد کے لئے ہم کو دوسری ہمسایہ اقوام کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنے سے روکتی ہو، یا ایک مشترک وطنی حکومت کے نشو و ارتقا میں مانع ہو؟ اگر ہندوستان کی دوسری قومیں بھی اپنے مخصوص قومی مفاد کے لئے اس قسم کی خود اختیاری (AUTONOMY) حاصل کر لیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور ان سب کو ایسی خود اختیاری حاصل ہونے کے بعد بھی ہندوستان کا مشترک نظامِ حکومت بخوبی چل سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جن حضرات نے صرف نظری سیاسیات (THEORATICAL POLITIES) کا مطالعہ کیا ہے وہ "سلطنت در سلطنت" کا نام سن کر کان کھڑے کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ یہ ایک ناقابلِ عمل چیز ہے۔ لیکن عملی سیاسیات میں وسیع یا محدود پیمانے پر سلطنت در سلطنت کا وجود قریب قریب ہر ترقی یافتہ ملک میں پایا جاتا ہے۔ اور سیاسی انصاف کے لئے اس کا وجود ناگزیر ہے۔ جہاں سلطنت کا غلبہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ ملک کے تمام دوسرے طبقے سلطنت در سلطنت سے محروم ہو گئے ہیں وہاں ظلم اور بے انصافی کا دور دورہ ہے۔ علاوہ بریں واقعات اس کا ثبوت دیتے ہیں، کہ سلطنت در سلطنت ناقابلِ عمل چیز نہیں ہے۔ ہندوستان کے آئندہ نظام حکومت کی ترقی میں یہ اگر حارج ہو سکتی ہے تو صرف اس صورت میں جب کہ اس ملک کی مختلف قوموں کے اندرونی نظامات ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ طرزِ عمل اختیار کریں، اور اپنی مرضی کو زبردستی دوسروں پر مسلط کرنا چاہیں۔ لیکن ہمیں اس نوعیت کی سلطنت در سلطنت مطلوب نہیں ہے۔ جو انارکی اور خانہ جنگی برپا کرنے والی ہو۔ خالص دار الاسلام سے کم جس چیز کو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اولاً ہمیں خود اپنے اصولوں کے مطابق اپنے گھر کی تنظیم

و اصلاح کرنے کا اختیار و اقتدار حاصل ہو، ثانیاً ہندوستان کی سیاسی زندگی میں ہم کو اتنا اثر حاصل ہو کہ اس ملک کا سیاسی و تمدنی ارتقاء ہمارے اصول تہذیب اور مصالح قومی کے خلاف راستہ اختیار نہ کرنے پائے، اور ثالثاً اگر یہ ارتقاء ایسا کوئی راستہ اختیار کر رہا ہو تو ہم اتنے بے بس نہ ہوں کہ اپنی اجتماعی طاقت سے اس کو روک نہ سکیں —— یہی تین عناصر مل کر اس مفہوم کی تکمیل کرتے ہیں، جسے میں "تسلط" در "سلطنت" سے تعبیر کر رہا ہوں، اور یہ ایسی چیز ہے کہ اگر مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان کی دوسری قوموں کو بھی یہ حاصل ہو، تو اس سے کوئی بدنظمی واقع نہیں ہو سکتی۔ اسلامی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر اگر آپ محض عقل کی رو سے انصاف کا تقاضا معلوم کرنا چاہیں تو وہ صرف یہ ہے کہ جب ہندوستان تمام قوموں کا مشترک وطن ہے، اور اس کی خوش حالی و ترقی سب کے عمل اور سب کی محنتوں اور قابلیتوں کا نتیجہ ہے تو یہاں کسی قوم کو بھی اتنا با اقتدار نہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کر دے اور نہ کسی قوم کو اتنا بے بس ہونا چاہئے کہ وہ اپنی ان چیزوں کی حفاظت بھی نہ کر سکے جنھیں وہ جان و مال سے زیادہ عزیز رکھتی ہو۔

اعتراض آپ کے انداز تحریر سے خوف و ہراس کی بو آتی ہے۔ آپ ہندوؤں سے ڈرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو کھا جائیں گے۔ کیا یہ خوف محض اس وجہ سے ہے کہ وہ کثیر التعداد ہیں۔ اور مسلمان ان کے مقابلہ میں قلیل التعداد ہیں؟ کیا قرآن آپ کو یہی سکھاتا ہے کہ قوت اور غلبہ کا مدار کثرت اور قلت پر ہے؟ کیا اس سے بڑھ کر بھی اور کوئی بزدلی ہو سکتی ہے کہ مسلمان ان مشرکین سے ڈر جائیں جو ۳۳ کروڑ خداؤں کو پوجتے ہیں؟ مسلمان ایک موحد قوم ہے۔ اس کے پاس قرآن جیسی کتاب ہے، اس کے اندر ایمان کی حرارت ہے کیونکر ممکن ہے کہ کفار و مشرکین اس پر غالب ہو جائیں؟ مسلمانوں کو اپنی قوت پر اعتماد ہونا چاہئے، اور اسی اعتماد پر آزادی کی جنگ میں شریک ہونا چاہیے۔ اگر ان میں عزم اور ہمت ہو تو کسی قوت سے بھی انھیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ان پر دوسروں کا رنگ کیا چڑھے گا۔ ان کے پاس تو صبغۃ اللہ ہے جو تمام رنگوں پر غالب آنے والا ہے۔

جواب یہ اعتراض چند در چند غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے، اور زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے پیش

کہا گیا ہے جنھیں سوچنے سے پہلے بول دینے کی عادت ہے۔ انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہمیں خوف ہندوؤں کی طاقت سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی کمزوریوں، اور ان کمزوریوں سے ہے جنھیں قرآن نے قوموں کے اسباب زوال و فنا میں شمار کیا ہے۔ قرآن کسی جگہ بھی یہ نہیں کہتا کہ مسلمان صرف اس بنا پر دنیا میں غالب ہوں گے کہ ان کے نام عبد اللہ اور عبد الرحمٰن ہیں اور کفار صرف اس بنا پر ان سے مغلوب ہو جائیں گے کہ وہ شیام سندر یا رابرٹسن جیسے ناموں سے موسوم ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن اس تیرہ سو برس کی تاریخ میں نعوذ باللہ ہزاروں مرتبہ جھوٹا ثابت ہو چکا ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو خصوصیت کے ساتھ گذشتہ دو سو برس کی تاریخ کا ایک ایک لمحہ اس کے جھوٹ کا زندہ ثبوت ہوتا۔ (معاذ اللہ) یہ قرآن رکھنے والے موحد مسلمان جن کا آپ ذکر فرما رہے ہیں چین سے لے کر مراکش تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کروڑوں کی تعداد میں ہیں مگر کیا یہ چین کے بت پرستوں سے، روس کے ملحدوں سے، انگلستان، فرانس، ہالینڈ اور اٹلی کے تثلیث پرستوں سے مغلوب نہیں ہیں؟ یہی قرآن رکھنے والے موحد مسلمان صقلیہ اور اندلس میں بھی تھے۔ مگر کیا یہ وہاں سے حرف غلط کی طرح مٹا نہیں دیئے گئے؟ یہی قرآن رکھنے والے موحد فتنۂ تاتار کے زمانہ میں بھی تھے۔ مگر کس چیز نے ان کی تہذیب اور ان کی عظیم الشان سیاسی طاقت کو مشرکین تاتار کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچا لیا؟ یہ دنیا حقائق کی دنیا ہے، خوابوں کی دنیا نہیں ہے۔ آپ کلمہ لا الٰہ الا اللہ پڑھ کر سمجھتے ہیں کہ کوئی منتر آپ کو سکھا دیا گیا ہے جسے پڑھتے ہی طلسم کے پتلے غیب سے پیدا ہوں گے اور کفار کو تہ تیغ کر دیں گے۔ آپ قرآن اپنے گھر میں رکھ کر سمجھتے ہیں کہ کوئی تعویذ آپ کے پاس آیا ہوا ہے جس کا بس گھر میں موجود ہونا ہی اسے تمام آفات ارضی و سماوی سے محفوظ کر دے گا اور خدا اپنے قانون فطرت کو آپ کے لئے بدل ڈالے گا۔ وہ تمام اخلاقی عیوب اور وہ تمام قومی امراض اپنے اندر پالتے رہیے۔ جو کفار و مشرکین اور منافقین کے خصائل میں رہے ہیں، اور پھر یہ پندار بھی اپنے دماغ میں رکھئے کہ ہم وہی مومن ہیں جن سے اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ کا وعدہ کیا گیا تھا، اور جب کوئی یاد دلائے کہ ان کمزوریوں کے ساتھ آپ کسی انقلاب کے طوفان میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ تو اس کو بزدلی کا طعنہ دیجئے۔ یہ اگر بہادری اور عقلمندی ہے تو ایسی بہادری اور عقلمندی آپ ہی کو مبارک رہے۔ میں تو اسے خام خیالی

اور طفل تسلی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ زندگی کے نہیں تباہی کے لچھن ہیں۔ میں اس سپہ سالار کو احمق سمجھتا ہوں جو اپنی فوج کے کمزور پہلوؤں سے آنکھیں بند کر لیتا ہے، جوشیلے الفاظ سے اس میں طاقت کا جھوٹا پندار پیدا کرتا ہے، اور اسے خطابت کی شراب پلاتا ہے تاکہ وہ مدہوش ہو کر تباہی کی خندقوں میں کود پڑے۔

بے شک کثرت و قلت پر غلبہ و قوت کا مدار نہیں ہے یقیناً۔ کَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ایک حقیقت ہے۔ مگر کچھ سوچا بھی ہے کہ وہ کون سی اقلیت ہے جو اکثریت پر غالب آتی ہے؟ وہ اقلیت جس میں نظم ہو، جس میں اطاعت امر ہو، جس میں وحدت ہو، جس میں ایک نصب العین پر کامل اتفاق ہو، جس میں اپنے نصب العین کی خاطر اجتماعی جد و جہد کرنے اور جان و مال کی قربانیاں دینے کا جذبہ ہو، جس کے افراد میں سیرت کی مضبوطی اور اخلاق کی بلندی ہو، جس کے افراد اپنی تہذیب کے اصولوں پر سختی کے ساتھ عامل ہوں، اور جس میں منافقین کا وجود عنقا ہو۔ ایسی اقلیت اگر آپ میں ہو تو ۲۲ کروڑ ہندو کیا چیز ہیں، تمام دنیا کے کفار مل کر بھی آپ کو مٹا نہیں سکتے۔ لیکن فی الواقع کیا آپ ایسی ہی اقلیت ہیں؟ ایسی اقلیت آپ ہوتے تو یہ تین لاکھ انگریز ۶ ہزار میل کے فاصلے سے آکر آپ کے کروڑوں افراد کو غلام بنانے میں کیسے کامیاب ہو گئے؟ بچوں کی طرح خواب نہ دیکھئے، ہوش میں آکر اس دماغ سے بھی کچھ کام لیجئے، جو خدا نے آپ کو سوچنے اور سمجھنے ہی کے لئے دیا ہے۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ پڑھکر آپ نے خدا پر کوئی احسان کیا ہے جس کے معاوضہ میں وہ آپ کے لئے تمام قوانین طبعی کو الٹ دے گا؟ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اکثریت متحد ہو رہی ہے، اس میں نظم پیدا ہو رہا ہے، وہ ایک مرکز کی اطاعت پر مجتمع ہو رہی ہے، وہ ایک نصب العین کی خدمت کے لئے قربانیوں پر آمادہ ہے، اس نے اپنے منافقین کا بڑی حد تک استیصال کر دیا ہے، وہ اپنے افراد میں سیرت کی مضبوطی پیدا کر رہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں آپ خود اپنا حال بھی دیکھ سکتے ہیں۔ آپ میں کوئی نظم نہیں، کوئی مرکزیت نہیں، کوئی متفق علیہ نصب العین نہیں، کوئی صاحب امر شخص یا جماعت نہیں جس کی آپ اطاعت کریں۔ آپ کی مختلف پارٹیاں ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہو

رہی ہیں۔ کبھی جھانسی میں، کبھی بجنور میں، کبھی مراد آباد میں خانہ جنگی کیلئے آپکے اکھاڑے برپا ہوتے ہیں۔ خم ٹھونک کر بھائی کو بھائی چیلنج دیتا ہے، اور جب ایک بھائی دوسرے بھائی کو مار لیتا ہے، تو اغیار کے سامنے اپنی برادر کشی پر سینہ تان تان کر فخر کا اظہار کرتا ہے۔ آپکے افراد کیرکٹر کی ایسی کمزوری کا اظہار کر رہے ہیں جو ساری قوم کی ہوا اکھاڑ دیتی ہے۔ آج اس گروہ میں ہیں، تو کل دوسرے گروہ میں۔ آج یہ طاقت غالب ہے۔ تو اس کے ساتھ ہیں، کل دوسری طاقت ابھری نظر آئی تو دفعۃً انھوں نے بھی اپنی وفاداریوں کا رخ بدل دیا۔ افراد تو درکنار آپ کی جمعیتوں تک، کا یہ حال ہے کہ ان میں کسی قسم کی استقامت رائے نہیں پائی جاتی۔ غیر مسلم خواہ کوئی طرز عمل اختیار کریں، دو چار اسلامی جمعیتیں ان کے مخالف ہوں گی۔ تو دو چار ان کا ساتھ دینے کے لئے بھی کھڑی ہو جائیں گی، اور یہ حقیقت دنیا پر آشکارا کر دیں گی کہ مسلمانوں میں بہت آسانی سے تفرقہ ڈالا جا سکتا ہے۔ کیا یہی وہ قومی سیرت ہے جس کو لے کر آپ توقع رکھتے ہیں کہ آپ کے لئے کَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِیۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً کَثِیۡرَةً کا معجزہ صادر ہوگا؟

قرآن اور سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ خدا کے قانون میں جانبداری کہیں نہیں ہے۔ جو اس قانون کے خلاف چلے گا، خواہ وہ مومن ہی کیوں نہ ہو، پیس ڈالا جائے گا، اور جو اس کی شرائط پوری کرے گا، خواہ وہ کافر مشرک ہی کیوں نہ ہو، غالب اور فتح یاب ہوگا۔ صحابۂ کرام کی جماعت سے بڑھکر ایمان کی حرارت اور سیرت اسلامی کا استحکام رکھنے والی جماعت تو کوئی نہیں ہو سکتی۔ مگر ایسی کامل الایمان جماعت بھی مشرکین سے متعدد مرتبہ شکست کھا گئی، اور وہ بھی کس حالت میں؟ جب کہ خود سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان موجود تھے۔ اور بنفس نفیس ان کی قیادت فرما رہے تھے۔ جنگ احد میں صرف اتنا ہی قصور تو ہوا تھا کہ مومنین کے دلوں میں مال کی محبت آ گئی اور انھوں نے اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر ڈالی۔ نتیجہ کیا ہوا؟ پتھر کو پوجنے والے خدائے واحد کی عبادت کرنے والوں پر چیرہ دست ہو گئے۔ اور خود رسول خدا ان کے ہاتھوں زخمی ہوئے۔ حَتّٰۤی اِذَا فَشِلۡتُمۡ وَ تَنَازَعۡتُمۡ فِی الۡاَمۡرِ وَ عَصَیۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَرٰىکُمۡ

مَا تُحِبُّوْنَ ...... اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ وَّ الرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ فِیْٓ اُخْرٰىکُمْ فَاَثَابَکُمْ غَمًّا بِغَمٍّ (آل عمران - ۱۶) جنگ حنین میں صرف اتنی ہی کوتاہی تو ہو گئی تھی کہ مسلمانوں کو اپنی کثرت پر ناز ہو گیا تھا۔ قانونِ فطرت نے اس کی سزا یہ دی کہ مشرکین کے مقابلہ میں ان کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ وَیَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ کَثْرَتُکُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْکُمْ شَیْئًا وَّضَاقَتْ عَلَیْکُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ (التوبہ ۴) جو خدا ایسے بے لاگ قانون کے ساتھ اس کائنات پر حکومت کر رہا ہے، اگر اس سے آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ اہلِ ایمان کی صفات سے عاری ہونے کے بعد بھی وہ آپ کی حمایت کرے گا، اور ان مشرکین کے مقابلہ میں آپ کو ثابت قدمی بخشے گا جو اس کے قانونِ طبیعی کی شرائط آپ سے زیادہ بہتر طریقہ پر پوری کر رہے ہیں، تو میں آپ کی خدمت میں صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ آپ عقلِ سلیم اور علمِ قرآن دونوں سے محروم ہیں۔

مکتبہ جماعت اسلامی کی فہرست

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
رسالہ دینیات	عہ/	سلامتی کا راستہ	۶/
خطبات	۸/	اسلام اور جاہلیت	۶/
مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش (۱)	۸/	نشانِ راہ	۶/
〃 〃 〃 (۲)	۸/	اسلام کا نظریۂ سیاسی	۶/
〃 〃 〃 (۳)	۸/	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	۶/
مسئلہ قومیت	۸/	ایک اہم استفتار	۲/
تنقیحات	۸/	انسان کا معاشی مسئلہ	۶/
تفہیمات	۸/	نیا نظام تعلیم	۶/
مسئلہ جبر و قدر	عہ	انگریزی ترجمہ رسالۂ دینیات	۸/
تجدید و احیاے دین	عہ	〃 〃 نظریۂ سیاسی	۱۲/
پردہ	۸/	〃 〃 اسلامی حکومت	۱۲/
حقوق الزوجین	۸/	نیشنلزم اینڈ انڈیا	۱۲/
اسلام اور ضبطِ ولادت	۱۲/	دستور جماعتِ اسلامی	۲/
الجہاد فی الاسلام	۸/	ہیگل مارکس اور نظام اسلام	۸/

مکتبہ جماعتِ اسلامی، دارالاسلام، پٹھانکوٹ

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن دارالاسلام متصل پٹھانکوٹ سے شائع کیا